قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی (القرآن الکریم)

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا۔

المجاہد من جاھد نفسہ — مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے (الحدیث)

ماہنامہ

المرشد

چکوال

بیاد

شیخ العرب والعجم، صدیق دوراں، مجدد طریقت، مجتہد فی التصوف، بحر علوم شریعت، قلزم فیوض و برکات،

امام اولیاء، شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ حضرت العلام اللہ یار خان علیہ الرحمۃ

مقام اشاعت

دار العرفان ۔ منارہ ۔ ضلع چکوال

اداریہ

رمضان المبارک برکتوں، رحمتوں اور مغفرت کا مہینہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا مہینہ بھی ہے جس میں مسلمانوں کے مختلف کردار پہچاننے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ روزہ رکھنا صرف اس لیے پسند نہیں فرماتے کہ خواہ مخواہ کی دقیانوسی قسم کی فاقہ کشی ہے جو جسم نازک کیلئے بوجھ گراں ہے۔ البتہ ہماری کلچرڈ سوسائٹی کی افطار پارٹیوں میں ایک نئی زندگی اور رونق آجاتی ہے۔ اور ایسی افطار پارٹیوں میں شرکت باعثِ ثواب بھی ہوتا ہے۔ ایک اور گروہ ہے جو روزے کے احترام میں جھکے جھکے جاتے ہیں لیکن بے چارے روزہ اس لیے نہیں رکھ سکتے کہ "مجبوری" ہے۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں کہ جو نہایت پابندی کے ساتھ اس ماہ کے ہر جمعہ کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ پہلا اور آخری روزہ کبھی نہیں چھوڑتے اور یوں پورے رمضان کے ثواب کا حق دار بن کر عید کی خوشیوں میں شمولیت فرماتے ہیں۔ ——— چوتھا گروپ ان لوگوں کا ہے جو دھوم دھام سے روزہ رکھتے ہیں۔ سحری اور افطار پر رونق ان ہی کے دم سے ہوتی ہے۔ (اور پھر دن بھر سو کر روزے کی اذیت کو کم کرتے ہیں) تحفظِ روزہ بھی اسی گروپ کے ذمہ ہے جہاں تک نماز و عبادات کا معاملہ ہے چونکہ یہ باتیں سال کے باقی گیارہ مہینے بھی چل سکتی ہیں اس لیے ان کو کسی اگلے موقعہ کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک وقت میں ایک ہی فرض پورا کرنا کافی ہوتا ہے۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس ماہ اپنا حق بندگی پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ روزے کے ساتھ ساتھ باقی تمام عبادات کا اہتمام بھی پوری طرح ہوتا ہے۔ مساجد کی رونق اور لاؤڈ سپیکروں کی جان ان کے دم سے قائم رہتی ہے۔ پورے سال کے نہ صرف گناہ معاف کروا لیتے ہیں بلکہ ہر عبادت کے ثواب کو اتنے ستر ہزار سے ضرب دیتے چلے جاتے ہیں کہ ثواب والے پلڑے کا وزن دیکھ کر کشش ثقل بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کے ساتھ یہ سودا برا بھی نہیں۔ ایک اور بے ضرر قسم کا گروہ بھی ہے جو کم ہی نظر آتا ہے۔ روزہ رکھتے ہیں عبادت کرتے ہیں لیکن نہ تو ان کا روزہ نظر آتا ہے نہ عبادت ایسے بے نیاز ہیں کہ اپنی عبادات کو ستر ہزار سے ضرب دینے کا تکلف بھی نہیں کرتے جزا و ثواب کی پرواہ بھی نہیں۔ پوچھو تو کہتے ہیں "بس مالک کا حکم ہے۔ اور مالک کی خوشنودی ہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ہمیں ثواب کی گنتی سے کیا غرض"

آیئے! ذرا ہم اپنی اپنی سوچ میں جھانک کر دیکھیں ہم کس گروپ میں فٹ آتے ہیں۔

تاج رحیم

ذکرِ الٰہی اور سکونِ قلب

حضرت مولانا محمد اکرم

انسانی ضرورت ہی کسی چیز کو اہم یا غیر اہم بناتی ہے۔ کوئی بھی شے اگر وہ انسانیت کے لیے ضروری نہ ہو تو وہ اہم نہیں رہتی کسی بھی چیز کا اہم یا غیر اہم ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی انسان کو یا انسانیت کو کتنی ضرورت ہے۔ جس چیز کی جتنی شدت کے ساتھ ضرورت ہوتی ہے وہ چیز اتنی ہی زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ تو اس طرح سے اہمیت و ضرورت یہ دو چیزیں نہیں ہیں نام ضرور ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے ملے ہوئے ہیں کہ جو چیز جتنی اہم ہے وہ اتنی ضروری بھی ہے اور جو چیز جتنی ضروری ہے وہ اتنی اہم بھی ہے

ذکر کی ضرورت کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ انسان کے پاس فضیلت کے لیے کیا سامان ہے کہ اسے دوسری مخلوق پر فضیلت دی جائے اگر ہم کہیں کہ انسان زیادہ علم رکھتا ہے تو یہ بات شاید درست ثابت نہ ہو۔ یقیناً ایسے علوم ہیں جن تک انسان کی رسائی نہیں اور وہ دوسری مخلوق کے پاس ہیں مثلاً ایک ادنیٰ سی مکھی جیسا شہد بنا سکتی ہے ایسا انسان نہیں بنا سکتا۔ بنانا بھی ایک علم ہے۔ وہ پھل بھی موجود ہیں۔ پھول بھی موجود ہیں۔ درخت پتے بھی موجود ہیں۔ لیکن آج تک انسان مکھی کا محتاج ہے۔ شہد لینے میں انسانوں کے پاس علم نہیں ہے کہ وہ پھولوں کا رس لے کر اسے شہد میں تبدیل کر دے تو یہ چھوٹی سی چیز جو ایک حقیر سی مکھی لگتی ہے جس کے پاس ایک ایسا علم ہے جو انسانوں کے پاس نہیں ہے کائنات تو بہت وسیع ہے۔ اس میں کتنی ایسی اللہ کی مخلوق ہے جس کے پاس ایسے علوم ہیں جو انسانوں کے پاس نہیں ہیں۔

جنگلوں میں جو جانور رہتے ہیں ان پر جو تحقیق کی جاتی ہے ان سے بڑے بڑے عجیب نتائج سامنے آتے ہیں مثلاً یہ گوشت کھانے والے درندے جو ہیں جب بیمار پڑتے ہیں ایک قسم کی گھاس کھاتے ہیں اور ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک انسان اس گھاس کو یا اسکی خصوصیت کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ سمجھ نہیں آتی وہ کون سی گھاس کھاتے ہیں

آپ نے کبھی گھریلو کتوں کو نوٹ کیا ہو تو یہ گھریلو گھاس پہ گزارہ کر لیتے ہیں اگر یہ اپنی طبیعت خراب محسوس کریں۔ بندروں پر یہ تجربہ کیا گیا کہ انہیں انسانوں کی طرح بواسیر ہو جاتی ہے بہت بڑے بڑے انسانی قد جتنے بندر ہوتے ہیں تو وہ ایک خاص قسم کا پتہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے کھانے سے بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ بندر کہاں سے تلاش کرتے ہیں۔ اور وہ

کیسے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی ابھی تحقیق میں نہیں ہے کیونکہ انسان نے یہ دیکھا ہے کہ بندروں کو بواسیر ہوتی ہے۔ پھر وہ جنگل میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر آتے ہیں ٹھیک ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض مریض بندروں کے پاس کچھ پتے تھے۔ جو وہ کھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ پھل کھانے والے جانور ہیں گھاس یا سبزی یا پتے کھانے والا تو نہیں ہے۔ اس طرح کی ایسی چیزیں ہیں اپنی طب پر انسان کو بڑا ناز ہے۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ طب کی بعض باتیں ایسی ہیں جو جانور جانتے ہیں انسان نہیں جانتے۔ دوسری مخلوق یعنی نظر نہ آنے والی، جناب یا شیاطین یا ان سے اعلیٰ مخلوق فرشتے ہیں ان کے علوم کے ساتھ تو انسان کا مقابلہ نہ رہا۔ ادنیٰ قسم کی مخلوق میں سے کبھی ہمارے پاس موجود ہے وہ قیمتی شہد بنا لیتی ہے بعض چیزیں وہ ہم سے زیادہ جانتی ہے تو پھر کوئی ایسی بات انسان کے پاس نہیں کہ کوئی تحقیقات اس کی زیادہ ہیں یا علوم زیادہ ہیں۔

اگر ہم بلحاظ قد و قامت بہترین لوگ کہیں تو میرے خیال میں انسان کوئی زیادہ قد و قامت کے یا خوبصورت نہیں، خوبصورت جانور ہیں خوبصورت گھوڑے ہیں، خوبصورت بیل ہیں۔ خوبصورت پرندے ہیں۔ بہت سی خوبصورت قسمیں جانوروں میں ملتی ہیں اگر ہم طاقت میں دیکھیں تو جانوروں میں ہاتھی جیسی قوت ہے۔ انسانی طاقت ان کے سامنے کچھ بھی نہیں کرتی۔

تو پھر انسان کو شاید عبادت میں فضیلت ہوگی یہ اللہ کریم کی عبادت کرتا ہے اور مخلوق نہیں کرتی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں انسان گنتی کے چند سال یا چند ہفتے دنیا میں رہتا ہے جو فرشتے جب سے اللہ نے پیدا کئے تب سے جب تک اللہ انہیں رکھے گا۔ سوائے تسبیح کے ان کا کوئی کام ہی نہیں ہے اور جو کام کرتے ہیں۔ وہ بھی سوائے اطاعت الٰہی کے دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ جو رکوع میں کھڑے ہیں رکوع میں رہیں گے جو سجدے میں ہیں۔ وہ ہمیشہ سجدے میں رہیں گے۔ عبادات میں تو سرتابی نہیں کرتے ان کی زندگی ہزاروں کروڑوں برسوں پہ محیط ہے۔

تو پھر انسان کی فضیلت کیا ہے۔ انسان کی فضیلت جو اللہ جل شانہ نے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی، اللہ کی کتاب نے بتائی وہ یہ ہے کہ اس ساری تخلیق میں ایک انسانیت ایسی مخلوق ہے جسے وہ شعور بخشا گیا کہ یہ اپنی حیثیت کے مطابق اللہ کی عظمت کو جان سکتا ہے۔ اور یہ وہ راز ہے جسے نہ فرشتہ سمجھ سکتا ہے، نہ جن، نہ شیطان نہ زمین، نہ آسمان، نہ کوئی دوسری مخلوق، ساری مخلوق وجود باری کا اقرار کرتی ہے۔ اللہ کے حکم کی اطاعت کرتی ہے۔ لیکن ذات باری سے آشنائی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ نہ ان میں یہ شعور ہے نہ ان میں یہ جرأت ہے نہ اس کی قوت برداشت ہے۔ تجلیات ذاتی جو ہیں انکو انسان کے سوا دوسری مخلوق برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ ایک وصف ہے انسان میں اور یہ مطلق انسان میں ہے۔ اس لیے کوئی بھی شخص مدتوں کافر رہے اگر اسے ایمان نصیب ہو جائے تو اس کا قلب منور ہو سکتا ہے۔ وہ سارے انعامات قرب اور سارے منازل قرب جتنے اللہ اسے نصیب کرے وہ حاصل کر سکتا ہے یعنی وہ انسانی خصوصیت اس میں موجود رہتی ہے۔ تا آنکہ کسی کا خاتمہ کفر پہ نہ ہو۔

اگر کفر پہ کسی کی موت واقع ہو جاتے پھر یہ استعداد سلب ہو جاتی ہے جس کا کہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ کفر پہ مرنے والوں کو کبھی نجات نصیب نہیں ہوگی۔ وہ استعداد ان سے سلب ہو گئی جس پہ مدار نجات تھا یا جو اللہ کی طرف لے جانے والی چیز تھی۔ یا جو تجلیات باری کو برداشت کرنیوالی چیز تھی وہ تو سلب ہو گئی اور ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوئی۔ صرف یہ ایک فضیلت انسان کے پاس ہے۔

ہمارے علماء میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں جو جھگڑا ہوتا ہے۔ خصوصاً آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں کوئی کہتے ہیں نور ہیں کوئی کہتے ہیں بشر ہیں تو حقیقت میں راز صرف اتنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انسان ہیں حقیقتاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس بات سے انکار کر دے کہ حضورؐ انسان نہیں تو اس نے آپ کے تمام محاسن سے، تمام فضیلتوں سے انکار کر دیا کیونکہ ساری فضیلتوں کا سارے مناصب کا تمام فضائل کا مدار انسان ہوتا ہے اگر معاذ اللہ حضورؐ نہیں تھے تو پھر اعلیٰ مخلوق فرشتے ہوں گے۔ تو فرشتوں کو یہ فضیلت تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انسان تھے یا انسان کے لیے قرآن نے عربی میں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ

بشر ہے۔ جسے ہم عمومی طور پر انسان کہتے ہیں۔

اردو میں جب بشر استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں وہ احترام کا پہلو نہیں ہوتا جو عربی میں ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک مفہوم ہوتا ہے تو ہم زیادتی یہ کرتے ہیں کہ عربی الفاظ کو پنجابی سمجھ لیتے ہیں بعض پنجابی الفاظ کو عربی سمجھ لیتے ہیں ہر لفظ کو اس زبان کے مفہوم کے اعتبار سے سمجھنا چاہیئے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ انبیاء بھی بشر ہوتے ہیں۔ انسان ہوتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہیں بشر ہیں تو ساتھ یہ اقرار بھی ہو گا کہ بشریت انسانیت کی انتہا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی دوسرا ایسا انسان اللہ نے پیدا نہیں کیا۔

یعنی فضائل انسانیت کمالات انسانیت اور کمالات بشریت جو ہیں وہ تمام ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات پر آپ ہی خیر البشر ہیں۔

تو یہ جو فضیلت ہے یہ تحقیقی طور پر ہر انسان میں ہے۔ فرشتے بنیادی طور پر نورانی مخلوق ہیں اللہ کی ذات جو ہے وہ تقسیم سے بالاتر ہے۔ اللہ احد۔ ایک ہوتا ہے واحد اکیلا ہوتا ہے۔ جس کے آپ ٹکڑے کر دیتے ہیں کوئی اکائی واحد کہلاتی ہے اس اکائی کو آپ توڑ دیں تو وہ دو بھی ہو سکتی ہے۔ ایک کمرہ ایک مکان ایک موٹر یہ سب سب واحد ہیں۔ لیکن اس ایک میں بہت سے پرزے ہیں۔ جب ہم توڑ دیتے ہیں تو ایک کی ہزار بھی بن جاتی ہے۔ لیکن جب اَحد کہا جاتا ہے کہ یہ وہ اکائی ہے جس کو آگے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایک ہونے کی انتہا ہے جس سے آگے ایک کے دو نہیں ہو سکتے۔

تعالیٰ جل شانہٗ ایسا یکتا ہے کہ وہ احد ہے اس میں کوئی دو ہونے کا تصور نہیں۔ اس لیے تشریح فرمائی لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ: نہ کوئی اس سے ہے نہ وہ کسی سے ہے نہ اس کا کوئی ماں باپ ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ وہ کسی کا جزو ہے نہ کوئی اس کا آگے کوئی جزو چلتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کے برابر کا ہے۔

اب یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اَحد کا کوئی چھوٹا یا بڑا حصہ ہیں۔ اَحد ہے اگر آپ اس کا حصہ کریں گے تو اَحد نہیں رہے گا۔ اس کا چھوٹا حصہ کریں گے۔ تو وہ بھی تو اللہ ہی ہو گا۔ چھوٹا کہہ لیں۔ آپ ہیرے کا سب سے چھوٹا ٹکڑا لیں تو کیا وہ ہیرا نہیں ہوتا۔ چھوٹا ہو گا ماہو گا تو ہیرا ہی۔ اب ایک بڑا شیشہ ہے آپ اس کا چھوٹے سے چھوٹا ریزہ لیں تو چھوٹا ریزہ شیشہ نہیں ہو گا؟ پتھر ہے اس کا چھوٹے سے چھوٹا ریزہ لیں تو پتھر نہیں ہو گا؟ اس طرح اللہ کی ذات کا اس کے ذاتی نور کا ذاتی تجلیات کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ لیں تو وہ بھی اللہ ہی ہو گا۔ اس لیے یہ تصور ہی باطل ہے کہ اللہ کی ذات کا حضور حصہ ہیں۔

اللہ خالق ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم مخلوق ہیں۔ اب مخلوق میں نوری مخلوق ہے۔ سب فرشتوں کے سردار ہیں۔ جبرائیل امین، تو شب معراج کی حدیث میں موجود ہے کہ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر اس حجاب سے آگے میں جھانک کر بھی دیکھوں تو میں تو یہ داشت نہیں کر سکتا۔ اس سے آگے میری مجال نہیں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر کی یہ ابتدا تھی۔ آگے کہاں تک تشریف لے گئے۔ یہ اللہ جانے اللہ کا حبیب جانے۔ یعنی جو نوری مخلوق ہے اس کے منازل بہت پیچھے رہ گئے۔

تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت و انسانیت کا انکار کر کے اگر نوری مخلوق میں شامل کیا جائے تو یہ تو حضورؐ کے محاسن و فضائل کا انکار کر کے آپ کو اوپر سے نیچے کی طرف گامزن کر دیا اور یہی فضیلت ہر انسان کی ہے کہ اس میں یہ استعداد ہوتی ہے لیکن یہ استعداد از خود روشن نہیں ہوتی۔

نبی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے روشنی لیکر مبعوث ہوتا ہے۔ لیکن نبی کے علاوہ ساری مخلوق مکلف ہے اس بات کا کہ یہاں آکر ان کو حاصل کرے۔ صرف نبی ایک ایسی ذات ہوتی ہے جو روشنی لے کر آتا ہے۔ جو نور لیکر آتا ہے جو تجلیات لے کر آتا ہے۔ جو علوم لے کر آتا ہے جو اللہ کی پہچان اور معرفت لے کر آتا ہے اور باقی جو انسانیت ہوتی ہے وہ محتاج ہوتی ہے۔

پچھلے دنوں مجھ سے ایک دوست پوچھ رہے تھے مقصد تو نیکی ہے بعض جو ہندوؤں کے گھروں میں نیک آدمی پیدا ہوتے ہیں وہ بھی نیکی کرتے ہیں۔ اچھے کام کرتے ہیں، چوری نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں کرتے۔ ہسپتال بنا دیتے ہیں بھلائی کا

کام کرتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے ڈیوٹی اچھی طرح کرتے ہیں۔ حلال کا رزق کھاتے ہیں تو وہ جنت میں کیوں نہیں جائیں گے۔ میں نے کہا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ ان کو وہ دینا چاہتے ہیں جو وہ نہیں مانگ رہے۔

کافر جو کچھ بھی کرتا ہے وہ نہ آخرت کے لیے کرتا ہے نہ اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اگر وہ آخرت کے لیے کرتا ہے تو آخرت کا تو علم ہی نبی کے پاس ہے اگر وہ آخرت کو جنت میں جانا چاہے گا تو آخرت کا مسئلہ ویسے ہی الٹ ہو گیا۔ اگر آخرت کے لیے کیا تو پھر تو وہ کافر نہ رہا مومن ہو گیا۔ پھر اس نے جو کچھ کیا اتباع نبوی کیا۔ پھر تو وہ مومن ہے اور اگر وہ نبی کو نہیں مانتا آخرت کو جان ہی نہیں سکتا تو جب آخرت کو جاننے کا ذریعہ ہی نبی ہے آخرت کو تو وہ جانتا نہیں پھر کرتا ہے بھلائی کا کام۔ ظاہر ہے اس کے سامنے کوئی دنیاوی مقصد ہو گا یا شہرت ہو گی، عزت ہو گی یا دولت کو بڑھانا مقصد ہو گا۔ کوئی نہ کوئی دنیاوی مقصد ہو گا۔ اور یہی بات اللہ نے کتاب میں ارشاد فرمائی ہے کہ کافر کی نیکی دنیا میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ کرتا ہی دنیا کے لیے ہے۔

آپ کسی دکاندار کو کہتے ہیں کہ مجھے دس روپے کی چینی دے آپ اُسے دس روپے دیتے ہیں چینی لے لیتے ہیں۔ اگر آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ شام کو مجھے یہ انہی روپوں میں آٹا بھی دیدے گا وہ نہیں دے گا۔ آپ نے تو روپے چینی کے لیے دیئے تھے۔ چینی تو آپ نے لے لی۔ آپ یہ بات ذہن میں بٹھائے رکھیں کہ میرے دس روپے اس کے پاس ہیں آٹا بھی دے گا آٹا نہیں دے گا۔

یعنی کافر نے دنیا کے لیے بھلا کام کیا اور اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی بھلائی دنیا میں لوٹا دی۔ اس کا حساب تو یہاں ہو گیا۔ میں نے کہا آپ خواہ مخواہ فکر میں گھل رہے ہیں۔ اور اگر وہ آخرت کے لیے کرتا ہے تو آخرت کو جاننے کا ذریعہ ہی نبی ہے اگر نبی کو نبی مانے گا تو کافر نہیں رہے گا۔ یہ بڑا سیدھا مسئلہ ہے کہ نیکی جو آخرت کے لیے ہو گی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ہو گی۔ کیونکہ آخرت سے کوئی نبی کے بغیر مطلع نہیں کر سکتا۔ اب یہ اتنا وسیع حوصلہ انسان میں کیسے پیدا ہو گا کہ وہ یہاں جتنا لیتا ہو اور کام آخرت کے لیے کرتا ہو۔ بڑی عجیب بات ہے ہمارے ماں باپ، بیوی بچے بہن بھائی ہوتے ہیں ہم دنیا کے دوسرے کونے میں بھی چلے جائیں تو وہاں ہم یہاں کے لیے کماتے ہیں اس لیے کہ یہاں رشتہ وہاں کی نسبت مضبوط ہوتی ہے، ہم رہتے وہاں ہیں نوکری وہاں کرتے ہیں فکر یہاں کی ہوتی ہے پیسہ یہاں کے لیے بچاتے ہیں۔ بھیجتے یہاں ہیں ذہن ہیں یہ جگہ بسی ہوتی ہے۔

آخرت کے لیے بھی آدمی کام تب کر سکتا ہے کہ اس کا رشتہ آخرت کے ساتھ مضبوط ہو جائے۔ وہاں کچھ تعلق ہو وہاں کچھ رشتہ ہو وہاں کی کچھ فکر ہو۔ اب یہ کیسے ہو۔ یہ صرف ایسے ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہو۔ اور وہ عالم جہاں اللہ کا ذاتی دیدار ہو گا۔ جہاں ہر شخص کو اللہ سے کلام کرنے کی توفیق ہو گی۔ اور یہی سب سے بڑی محنت ہے آخرت کی اور جب تک یہ فیصلہ دل میں نہ ہو آخرت کی کوئی طمع بھی انسان سے دنیا نہیں چھڑا سکتی۔ آپ جنت کے محلات کا لالچ دیں۔ دنیا کے اینٹوں کے مکان زیادہ محبوب ہیں اسے آپ اسے آخرت کے اچھے ٹھکانے اچھے لباس اچھے کھانے بتاتے رہیں وہ کہتا ہے جو کھانا مجھے یہاں ملتا ہے یہ مجھے ٹھیک ہے۔ اور اس میں مزید کچھ لذتیں مل جائیں کچھ مزید پیسے مل جائیں اچھی سی موٹر مل جائے تو وہ ٹھیک ہے۔

ایک ذات باری ایسی عظیم نعمت ہے۔ تجلیات باری کلام باری ایسی عظیم نعمت ہے یہاں اس کے گھر میں نہیں ہے نہ یہاں حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اللہ کے ساتھ اس کا تعلق پیدا ہو جائے اور اس کی تجلیات کی طلب اس کے دل میں آجائے اور وہ اس کے دل میں اپنی تجلیات ڈال دے اس کا دل روشن ہو اب اس میں تڑپ پیدا ہو گی کہ ان سب چیزوں کو میں ظاہر کی آنکھوں سے بھی دیکھوں۔ یہ جو میرے دل میں بستا ہے یہ میرے روبرو بھی ہو۔ میں اس سے باتیں کروں۔ کیسے کروں گا۔ اس کی جگہ ہے آخرت۔ پھر وہ آخرت کی تیاری کرے گا۔ مجھے وہاں جانا ہے۔

اسی لیے اللہ نے کافر کے لیے فرمایا کہ یہ میری ملاقات سے ناامید ہے اس لیے کفر پہ ہے یعنی انہیں مجھ سے ملنے کی

امید نہیں رہی مجھ سے ملنے کی بات اگر دل میں ہوتی کبھی کفر میں گمراہ نہ رہتے۔ کفر میں اس لیے ٹھیک رہے ہیں کہ مجھ سے ملنے کی تڑپ نہیں رہی۔

صرف یہ ایک بنیاد ہے۔ جو انسان کو اس قربانی پہ آمادہ کرتی ہے کہ وہ رہے تو یہاں لیکن بھوکا سو جائے اور حرام مت کھائے کہ حرام کھانے سے اللہ سے ملاقات جاتی رہے گی۔ حرام کھانے سے شاید اللہ کریم مجھ سے بات نہ کریں۔ کہاں ہو گی بھئی میدان حشر میں ہو گی جنت میں ہو گی۔ تو وہاں تک کے لیے یہاں بیٹھ کر یہ تب تیاری کرے گا۔

اب اللہ سے کیسے رشتہ پیدا ہو گا۔ تعلق پیدا کرنے کے لیے ہم جنس ہو انسان کو انسان سے محبت ہو سکتی ہے۔ انسان کو پتھر سے بھی محبت ہو سکتی ہے اس لیے کہ اس کا رنگ دیکھ سکتا ہے اس کی خوبصورتی دیکھ سکتا ہے۔ اسے محسوس کر سکتا ہے اسے ہار میں سجا سکتا ہے۔ بیوٹی پہ لگا سکتا ہے۔ انسان کو کسی پرندے سے پیار ہو سکتا ہے۔ اس کا رنگ دیکھ سکتا ہے اس کی سریلی آواز سمجھ نہیں سکتا سن تو سکتا ہے۔ اللہ سے کیسے محبت کرے گا نہ یہ اللہ کو یہاں دیکھ سکتا ہے ان کانوں سے اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ ہاتھوں سے اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ پھر جب اس کے تمام ادراکات کی رسائی سے بالاتر ہے تو پھر اس کے ساتھ محبت کیسے کریگا اس کے لیے دنیا کو قربان کیسے کرے گا۔

اس کا ایک ذریعہ ہے جو ارشاد فرمایا گیا جو خود اللہ نے تجویز فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ تم میرا نام جپو ہے صرف اس سے میری محبت میرا پیار تمہارے دل میں بسے گا۔ یعنی صرف یہ ایک راستہ ہے۔ صرف یہ ایک طریقہ ہے۔ صرف یہ ایک ذریعہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ کی محبت اللہ کی معرفت، اللہ جل شانہ، کی طلب آجائے اسی لیے فرمایا کہ دل چونکہ بنیادی طور حصول معرفت کے لیے انسان کو دیا گیا تو دل جب تک معرفت الٰہی کو پا نہیں لیتا بے قرار رہتا ہے۔ کبھی کافر کے دل کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔ کبھی اس دل کو سکون نصیب نہیں ہوتا جو معرفت الٰہیہ سے دور رہے خواہ وہ مسلمان ہونے کا دعوی کرتا رہے اور وہ نمازیں بھی پڑھتا رہے۔ اس کی نمازیں بے کیف اس کے سجدے بے ذوق، نماز بے اثر اس کی تبلیغ بے اثر اس کا سفر رائیگاں جاتا ہے۔ ہاں فرمایا میری یاد کو مسلسل شروع کر دو۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ، تم میرا نام دہرانا شروع کر دو۔ دل میں اطمینان آنا شروع ہو جائے گا۔ اس لیے کہ صرف اسم ذات کی تکرار سے محبت الٰہی کا رشتہ استوار ہونا شروع ہو جائے گا۔ جب دل میں اللہ سے بات کرنے کی طلب پیدا کر لی اللہ کو دیکھنے کی طلب پیدا کر لی اللہ سے روبرو ہونے کی آرزو پیدا کر دے۔ یہ طلب پیدا کر دے کہ یہ ملاقات کہاں ہو گی۔ پھر جہاں ملاقات ہو گی وہاں کی تیاری شروع ہو جائے گی یہ سارا نظام از خود درست ہونا شروع ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ اتنی بڑی ضرورت ہے کہ صرف اس ضرورت کو سمجھنے والا انسان انسان بنتا ہے۔ ورنہ انسانیت کھو بیٹھتا ہے۔ انسان کی فضیلت ہی صرف اس بات پہ ہے تا کہ اگر اس بات کو نہیں پا سکا تو پھر وہ انسان نہیں رہتا۔ اپنے گرد دیکھیں روئے زمین پہ۔ آپ کو قد کاٹھ میں حلیے میں اعضاء و جوارح میں انسانی شکلیں نظر آئیں گی لیکن کوئی انسانی اقدار بھی روئے زمین پہ نظر آتی ہے؟ انسان درندے بن کے رہ گئے چرندے بن کے رہ گئے۔ یہ کیا ہے اس لیے کہ وہ انسان نہیں دلوں میں بربریت آچکی ہے وہ بات نہیں رہی۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر انسان کو جس قدر زندگی کی ضرورت ہے اس سے زیادہ زندہ رہنے سے زیادہ ذکر الٰہی کی ضرورت ہے اب جو چیز جان سے زیادہ ضروری ہے اس کی اہمیت بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ جتنی اس کی ضرورت ہے اللہ کریم توفیق نصیب فرمائے۔

گلگت

ایک بار پھر

حضرت مولانا محمد اکرم

پچھلے سال پر تولتے رہے مگر قدرت کو منظور نہ تھا ہم گلگت نہ پہنچ سکے ان دنوں بارشیں شروع ہوگئیں۔ اور راستے بند ہو گئے سڑک کا راستہ بھی مسلسل نو دن بند رہا ساتھ ہی ہوائی سروس بھی معطل رہی اور اپنا یہ حال کہ چار پانچ روز سال سے کھینچ تان کر نکالنے پڑتے ہیں۔ لہذا گلگت آنا موقوف ہوا۔ اور اس بار بفضل تعالے پانچ مارچ کو اسلام آباد ائرپورٹ سے جہاز میں بیٹھے جانب گلگت محو سفر تھے

میں نے شاید پہلے لکھا ہے کہ حسن فطرت پہاڑی وادیوں میں کس دریا دلی سے بکھیر گیا ہے مگر اب کے جہاز اڑا تو پنڈی شہر پھر اسلام آباد۔ فیصل مسجد اور اس کے دامن میں چھوٹی سی چھولداری پہ نظر جم گئی۔ یہاں اس مرد مجاہد کی مشت خاک آسودۂ راحت ہے جس نے دور حاضر کی تاریخ کو نیا رخ دیا۔

چھوٹے سے قد اور بھرے بھرے جسم کا مسکراتا ہوا مرد حق جس کی سیاست سے تو اختلاف بجا اور جس کی باتوں سے اتفاق ضروری نہیں مگر جس نے جہاد افغانستان میں وہ کردار ادا کیا کہ آئندہ کا مورخ چاہے بھی تو اسے فراموش نہ کر سکے گا۔ جس کی پامردی اور استقامت نے روسی افواج کو ذلت کے ساتھ واپسی پہ مجبور کیا۔ جسے رب کریم نے شہادت سے سرفراز فرمایا اور جس کی نماز جنازہ تاریخ میں مثالی نماز تھی جس کا مدفن نرالا ہے۔ اور جس کی یادیں دل کو تڑپا دیتی ہیں۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ اس کے درد دل کو عام کر دے۔ جہاز ایبٹ آباد کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

پھر تربیلا جھیل کی خوبصورت جھیل کا نظارہ بھی بہت خوبصورت ہونے کے علاوہ کسی حد تک اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ اس کا پھیلاؤ کہاں تک ہے۔ دریں اثنا اخبار میسر آیا جلدی جلدی چند سرخیاں دیکھیں کہ چائے آگئی اور جہاز دامن ہمالہ کے برفپوش پہاڑوں پر تھا حد نگاہ تک برف کی چاندی نے وادیوں اور چوٹیوں کو یوں لپیٹ رکھا تھا گویا انتہائی شفاف سفید روشن اور موٹے غلافوں سے ڈھک دی گئی ہوں۔ وادیاں دامن برف سے یوں بھرے تھے جیسے خوبصورت اور چمکتے ہوئے روشن چہرے والے بچے سے ماں کی گود بھری ہو۔

اللہ اللہ حسن فطرت کی جلوہ نمائیاں مگر دور ان بلندیوں اور دشوار ترین پہاڑوں پر جہاں سے جہاز تو گزر رہا ہے مگر زمین انسانی قدموں سے نا آشنا ہے۔ اس قدر رعنائیاں بکھیرنے کی

ضرورت کیا تھی۔ پتہ نہیں اس حکیم مطلق نے سب کچھ یہاں کیوں سجا دیا ہے۔ اب یہ روئی کے انبار قطرہ قطرہ شفاف پانی میں ڈھلیں گے پھر نالے ندیاں اور دریا بن کر زمینوں کو سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ بے شمار انسانی خدمات بجا لائیں گے تو کیا یہ حسن آبادی سے دور ہی ضروری تھا کہ وہاں سے شہروں اور بستیوں کا تصور یوں ابھرا جیسے کسی خوبصورت چہرے سے نیچلے بدن پر ناسور ہوں یا کوڑھی کا جسم جو جگہ جگہ سے کٹا پھٹا اور متعفن ہو۔

لوٹ مار، چوری، قتل و غارت گری آگ اور شعلے ظلم و بربریت، یتیموں کے نالے بے کسوں کی آہیں جنہیں چھپانے کے لیے ہر شہر میں بڑی بڑی اونچی عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ مگر عدل و انصاف مہیا نہیں کیا جا رہا۔ تو انسان کی یہ بھونڈی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔ اور ہر شہر پر ناانصافی کا دھواں مکانوں سے بہت بلند ہے یہ تو انسانی کردار ہے مگر بات تو قدرت کی تقسیم کی ہو رہی تھی۔ اللہ قادر ہے وہاں بھی حسن بکھیرا ہوتا تو معاً دماغ میں روشنی کا چھماکا سا ہوا اور ارشاد باری یاد آیا۔ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا" کہ میں نے تو روئے زمین کو حسن سے بھر دیا ہے اور مگر تمہاری آسائش کے لیے سجا دی ہے۔ اے انسانو یہ تم پر ہے کہ اب اسمیں فساد نہ پھیلاؤ اور حسن فطرت کے جلووں کو خراب نہ کرو، تو گردن ندامت کے بوجھ سے جھک گئی کہ اللہ نے تو واقعی آبادیوں میں اس سے زیادہ حسن لٹایا تھا یہ ہم ہیں جن کی نافرمانیوں نے انہیں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور ہدایت پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

جہاز تو پہنچ بھی گیا احباب منتظر تھے ہم گاڑیوں میں بیٹھے اور منزل کو چلے پہلے ہر بار احباب کوئی مکان خالی کر لیتے تھے مگر اب کی بار گزرتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ دریا پار کی آبادی بھی ختم ہو گئی تو ایک دینی مدرسے کا بورڈ نظر پڑا۔ مدرسہ نصرۃ الاسلامیہ اور گاڑی اندر گھوم گئی حیرت ہوئی کہ اب کے قیام مدرسے میں ہے بھلا کہاں ہم اور کہاں یہ عظیم درسگاہیں۔ مگر پتہ چلا کہ مہتمم صاحب اور صدر مدرس صاحب کا اصرار تھا۔ خیر پہنچے ایک خوبصورت مہمان خانہ بنا ہوا تھا اس میں دو ہی کمرے اور ساتھ غسلخانہ وغیرہ ہم نے ڈیرہ لگایا۔ ذرا نیچے دفاتر اور سامنے مسجد زیر تعمیر ہے اور بہت مغرب کو ہٹ کر مدرسہ کی عظیم الشان عمارت جو واقعی قابل داد ہے۔ جناب مہتمم صاحب مولانا نذیر اللہ خان صاحب نائب مہتمم مولانا گل بشیر خان صاحب اور صدر مدرس جناب مولانا علیمی خان صاحب سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔ اساتذہ کرام ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ یہ نورانی چہروں والے جذبہ جہاد سے سرشار علماء واقعی قوم کا سرمایہ ہیں۔

ظہر کی نماز مدرسہ میں جا کر ادا کی۔ اور اساتذہ کرام اور طلباء سے بات کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جناب مہتمم صاحب نے خطبہ استقبالیہ میں بتایا کہ اس مدرسہ کی بنیاد قاضی عبدالرزاق مرحوم نے رکھی تھی پھر اسے صدیقی ٹرسٹ کراچی کی اعانت و سرپرستی نصیب ہوئی اور جناب منصور الزمان صدیقی صاحب نے تعاون کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کریم انہیں جزائے خیر دے۔ مدرسہ کی خوبصورت عمارت میں تین ہزار طلباء کے لیے گنجائش موجود ہے اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ اسماعیلیوں کے بچوں نے بھی قرآن حکیم پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اب اسی مدرسہ میں تقریباً ساڑھے تین صد اسماعیلی بچے قرآن کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں پھر صدیقی ٹرسٹ اور جمعیت تعلیم القرآن کراچی نے اس کام میں تعاون کر لیا۔ اب ان حضرات کے تعاون سے علاقہ بھر میں اسی مدارس چل رہے ہیں۔ جنکی عمارات دریاں کمبل کپڑے مدرسین کی تنخواہیں اور مدارس کے انسپکٹر تک ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ عمارات زیر تعمیر بھی ہیں۔ اساتذہ کے لیے رہائشیں بن رہی ہیں۔ اور بہت خوبصورت اور پائیدار کام ہو رہا ہے۔ ایک بہت بڑا کمرہ ان اشیاء سے بھرا ہوا تھا جن سے حسب ضرورت مساجد اور مدارس کو دریاں کپڑے کمبل وغیرہ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ بہر حال دل سے دعا نکلی کہ اس دور دراز پہاڑی علاقے میں دین کی اعانت کرنے والوں کو اللہ کریم اپنی رحمت سے نوازے۔ آمین۔

بندہ نے اپنے تقریباً پون گھنٹہ کے خطاب میں دینی علم کی عظمت پر بات کی جس کے دو پہلو عرض کئے اول یہ کہ دنیا کے سارے علوم انسانوں کے لیے رب کریم کا عطیہ ہیں اور ان کی اصل یہ ہے کہ بدن عطا فرمایا۔ اس کے ساتھ ضروریات لگا دیں۔ اور ان کی تکمیل کے ذرائع دنیا میں پھیلا دیئے۔ انسان کو عقل و خرد سے نوازا اور تحقیق و تفتیش کی خو بخشی اب یہ ان اشیاء

کو استعمال کرنے کے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے مختلف طریقے سوچتا اور سمجھتا رہتا ہے۔ دنیا کے سارے علوم اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اور وہ انسانی تحقیق سے روز افزوں ترقی کرتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں سب انسان حاصل کر سکتے ہیں مومن ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بد، ڈاکٹر، سائنسدان اور فلسفی بن سکتے ہیں۔ مگر دین کا علم وہ نور ہے جو اللہ نے اپنے خاص بندوں کو عطا فرمایا جو تخلیقی طور پر نبی تخلیق فرمائے وہ کسی انسان سے نہیں سیکھتے نہ ان کے علم کی بنیاد انسانی اندازوں پر ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کا علم غلطی کے امکان سے بری ہوتا ہے وہ براہ راست ذات باری سے حاصل کرتے ہیں۔ اور بندوں کو پہنچاتے ہیں۔ اور اس کے حصول کے لیے ایمان شرط اول ہے۔ کافر یہ نعمت حاصل کر ہی نہیں سکتا نہ صرف ایمان بلکہ نیکی سے حاصل ہوتا ہے اور بدکار بھی محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ مستشرقین کو دیکھیں جنہوں نے قرآن کو پڑھا، تفاسیر دیکھیں، احادیث پڑھیں ان کی شروح پڑھیں مگر انہیں حاصل کیا ہوا چند بودے اور بے وزن اعتراضات اسلئے کہ ان کے قلوب میں نور ایمان نہ تھا۔ دنیاوی علوم محض عقل سے سیکھ جاتے ہیں مگر علم دین کے لیے دل کی سلامتی ضروری ہے اس لیے وہ لوگ سب سے خوش قسمت ہیں جنہیں یہ نعمت نصیب ہو

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی دین کا علم حاصل کر کے میدان عمل میں جائے پیشہ اور روزگار کرے۔ معروف ذرائع سے رزق حلال کے لیے کوشش کرے۔ کاشتکار واپس جا کر کاشتکاری کرے۔ دکاندار کا بیٹا جا کر باپ کی جگہ لے، لوہار کا بیٹا لوہا کوٹے، فوج میں شامل ہوں۔ سول سروس میں جائیں۔ کوئی جوکیدار ہو کوئی کلرک بنے تیز علوم دنیا میں دسترس حاصل کریں۔ اور عہدوں پہ کام کریں کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ دین کا علم رکھنے والا بہتر کام کرتا ہے اور اچھا شہری اچھا کاشتکار نیک ملازم اور نیک افسر بن سکتا ہے۔ ہمیں شکایت ہے کہ ڈرائیور نماز کے لیے گاڑی کھڑی نہیں کرتے۔ مگر ہم اس طرح نہیں سوچتے کہ نمازی کیوں۔ ڈرائیور نہیں ملتے، رکشہ نہیں چلاتے، تانگہ نہیں بناتے۔ افسوس کا مقام ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم پانیوالے لاکھوں طلبا، واپس میدان عمل میں نہیں جاتے اور سارا میدان صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو دین سے بے بہرہ ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ کی والدہ ایک بزرگ خاتون تھیں اور اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوا دیتے تھے۔ ایک دفعہ دو آدمیوں نے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک صندوق آپ کے پاس بطور امانت رکھوایا۔ اس کے بعد ایک شخص آکر وہ صندوق لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شخص نے آکر صندوق طلب کیا۔ تو آپ نے کہا کہ تمہارے ساتھی کو وہ صندوق دے چکی ہوں۔ اس نے کہا کہ جب ہم دونوں نے ایک ساتھ رکھوایا تھا تو آپ نے میری موجودگی کے بغیر اس کو کیسے دے دیا۔ اس جملے سے آپ کی والدہ کو بہت ندامت ہوئی۔ اسی وقت حضرت امام شافعی بھی گھر میں آگئے اور والدہ سے کیفیت معلوم کر کے اس شخص سے کہا تمہارا صندوق موجود ہے لیکن تم تنہا کیسے آگئے۔ اپنے ساتھی کو ہمراہ کیوں نہیں لائے ہو پہلے اپنے ساتھی کو لے آؤ۔ یہ سنکر وہ شخص وہاں سے کھسک گیا۔

الا ماشاء اللہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف آٹھ مساجد نہیں بنائے تھے۔ بلکہ زندگی کے ہر میدان کو اللہ کے نیک اور صالح بندوں سے بھر دیا تو آپ نے دیکھا چند برسوں میں روئے زمین پر اسلام ایک بہت بڑی حکومت بن کر ابھرا جس میں اغیار کو بھی انصاف مہیا تھا اب بھی یہی راستہ ہے۔ آپ لوگوں کو علم دین جیسی عظیم نعمت سینوں میں سجا کر دنیاوی کمالات بھی حاصل کرنا ہوں گے میدان عمل میں جوہر دکھانے ہوں گے۔ تب اسلام کے نفاذ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچے گا انشاء اللہ، ورنہ آپ صرف مساجد میں آواز لگاتے رہیں گے اور باہر لوگ یہ کہتے رہیں گے کہ مولوی صاحب کو کیا خبر جو یہ کہتے ہیں وہ عملاً ممکن ہی نہیں ہماری سستی اور تساہل اور کام نہ کرنے کی وجہ سے اب لوگ کہتے ہیں کہ اسلام پر عمل ممکن ہی نہیں۔ عزیزان گرامی میدان عمل میں آئیں اور اغیار کے اس اعتراض کو اپنے عمل سے باطل ثابت کر دیں اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ بس خلاصہ کلام تو عرض ہوا اگرچہ تقریر طویل تھی مگر حاصل غالباً یہی تھا۔

دوسرا دن جنگل میں آتے جاتے میں گزرا۔ گاؤں کافی بلندی پر تھا اس لیے ہر نگاہ پر بہت ہی بہت خوبصورت نظارہ تھا صبح و شام محافل ذکر جن میں بفضل رب کافی احباب شرکت کرتے اور اسم ذات کے ذکر سے دلوں کو صیقل کرنے میں مصروف ہیں۔ الحمد للہ۔

آج صبح درس ہوا آیہ کریمہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کی تلاوت کا شرف حاصل ہوا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ ہمیں پانے کے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا کرتے ہیں۔

تو اس سے یہ حاصل ہوا کہ مجاہدہ ضروری ہے اس پہ پھل لگانا رب کریم کا کام ہے۔ پہلا مجاہدہ یہ ہے کہ آدمی تہمات سے بچے جن کاموں سے شریعت نے روکا ہے ان کو چھوڑ دے اور اسمیں جہد کرے یعنی بہت زیادہ کوشش کرے اگر سستی کرے گا تو مجاہدہ نہ ہو گا اور بغیر مجاہدہ کے گناہ سے بچنا مشکل لہذا گناہ سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو اپنی خواہشات کو روکنے کی کوشش کرنا بے حد ضروری ہے دوسرے یہ کہ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں بھی مجاہدہ کی راہ اپنائے اپنے آپ کے ساتھ کوشش کر کے خود کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پہ لگائے جو لوگ اس پہلو پہ سستی کی راہ اپناتے ہیں وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو جاتے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ شیخ کامل کو تلاش کرے اور اس کام میں بھی محنت کرے کہ نیکی کا جذبہ نیکوں کی صحبت ہی سے حاصل ہو گا۔ اور چوتھی صورت یہ ہے کہ ایسی مجالس نصیب ہو جائیں تو فائدہ حاصل کرنے میں کبھی سستی اور تساہل نہ کرے کہ قانون فطرت واضح ہے۔ جیسے ہم دنیا کے کاموں میں محنت کو ضروری سمجھتے ہیں کھیتی کو سنوارتے ہیں ہل چلاتے ہیں۔ مناسب موقع پہ اچھا بیج کاشت کرتے ہیں پھر اس کی رکھوالی کرتے ہیں۔ تب فصل حاصل ہوتی ہے۔ اب بارش ہونے پہ کوئی دانے بکھیر دے تو ضرور اُگ آئیں گے مگر فصل تیار نہ ہو سکے گی ایسے ہی شیخ کی صحبت کی مثال باران رحمت کی ہے مگر دل کی کھیتی کو تیار کرنا اور اس میں نیک اعمال کا بیج ڈالنا اس کی رکھوالی کرنا اور گناہ کی خرابی سے بچانا یہ سب کچھ بہت ضروری ہے اسے فصل کی صورت میں پکانا اس پہ مقامات و منازل کا عطا کرنا یہ اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ ذات کریم اپنے حصے کے کام میں کمی نہیں کرتی یہ ہم ہیں جو تساہل کا شکار ہو کر کھیتیاں خراب کر بیٹھتے ہیں لہذا مجاہدہ کی راہ اپنائیں اور اللہ کریم سے امید کرم رکھیں۔

اب مغرب ہو رہی ہے اور ان سطور پہ ختم کرتا ہوں یہ سفرنامہ لکھنا مقصد نہ تھا بس قارئین کو شریک محفل کرنا مقصود تھا جو کسی حد تک پورا ہوا۔ اللہ کریم ہماری خطائیں معاف فرمائے اور نیکی کی توفیق ارزاں فرمائے۔ آمین۔

کھانے پینے کے آداب اور احکام

حدیث عمر بن ابی سلمہ ؓ: حضرت عمر بن ابی سلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور نبی کریم ﷺ کے زیر نگرانی پرورش پا رہا تھا (عمرؓ بن ابی سلمہ کی والدہ حضرت اُم سلمہؓ تھیں جو بعد ازاں اُم المومنین بنیں) اور کھاتے وقت میرا ہاتھ پیالے میں ہر طرف گھوما کرتا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے لڑکے! بسم اللہ پڑھو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کے بعد سے میرے کھانے کا انداز ہمیشہ اسی کے مطابق رہا ہے۔

اخرجہ البخاری فی: کتاب الاطعمة: باب ۲ التسمية على الطعام والاكل باليمين

فلسفہ اور برکاتِ رمضان

حضرت مولانا محمد اکرم

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اور ساتھ ہی گرمی کی بھی۔ کچھ لوگ تو ائر کنڈیشن کمروں میں ہوں گے اور اکثر تپتی دھوپ میں کام کرنے پر مجبور۔ پھر دونوں طبقوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو رمضان المبارک کا شدید انتظار ہے اور ایسے بھی جو پریشان بھی ہیں۔ گھبرا رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ روزہ مشکل ہے بلکہ انہیں روزہ سرے سے رکھتا ہی نہیں۔ مگر وہ اور صرف وہ پریشان ہیں نہ جانے کیوں؟

آیئے دیکھیں کیا یہ مشقت صرف امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ڈالی گئی ہے یا کسی اور کو بھی اس سے سابقہ پڑا۔ "تم پر روزے صرف اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جسطرح تم سے پہلی امتوں پر تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ" اس آیہ کریمہ میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ روزے پہلی امتوں پر بھی فرض کئے گئے۔ نیز یہ محض مشقت نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے تربیتی پروگرام ہے اور وہ مقصد حصول تقویٰ ہے۔

تقویٰ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اللہ کی نافرمانی سے روک دے اور عملاً اللہ کی عظمت سے آشنائی نصیب ہو۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس بات پر شہادت دے کہ اسے اللہ سے تعلق عبدیت حاصل ہے۔ یہ اپنی حیثیت کے مطابق اللہ کی عظمت سے آشنا ہے۔

اور بالکل یہی بات پہلی آیہ کریمہ میں بھی ایک اور انداز سے ارشاد ہوئی ہے کہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو تمام انسانیت کے لیے جملہ امور میں ہدایت ہے اور نہایت کھلے انداز میں رہنمائی اور احقاق حق فرماتا ہے تو یہاں یہ خبر دی کہ اس مبارک مہینہ میں بندے کو رب کریم سے شرف ہمکلامی نصیب ہوا۔ جو معراج انسانیت ہے۔ اور جس کی استعداد صرف اور صرف انسانی پیکر میں ودیعت کی گئی ہے۔ ورنہ تو ساری مخلوق میں فرشتوں کو اعلیٰ درجے کی پاکیزگی اور طہارت حاصل ہے تخلیقی طور پہ نوری مخلوق ہیں اور کبھی نفس کی شرارتوں سے آزاد اور عملاً کبھی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور ہمیشہ اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ استعداد جو اللہ نے انسان میں رکھی ہے۔ فرشتوں کو نصیب نہیں ہوئی کہ اللہ کی معرفت کا واحد اور اکیلا سبب نبوت ہے جو صرف انسانوں کے حصہ میں آئی اور کوئی دوسری

مخلوق اس سے نوازی نہیں گئی۔ چنانچہ عوارضات بشریت کے باوجود فطرتاً ہر انسان میں فیضان نبوت سے مستفیض ہونے کی استعداد موجود ہے نیز اسے یہ کمال حاصل ہوا ہے کہ یہ بشری تقاضوں کے باوجود فرشتوں جیسی پاکیزگی اور طہارت حاصل کر سکتا ہے بلکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مقام عالی فرشتوں سے بھی بہت بلند تر ہے۔ جبھی تو وہ کلام باری سے نوازے جاتے ہیں اور کلام باری کا یہ خاصہ ہے کہ جو اس سے سرفراز ہوا وہ اعلیٰ درجے کی پاکیزگی سے سرفراز ہوا۔ سو براہ راست یہ مقام انبیاء میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ اور پھر تمام انبیاء علیہم السلام کا کہ جملہ انبیاء کے لیے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا شرط ٹھہرا۔ چنانچہ یوم میثاق میں ہی اس کی ابتداء ہو گئی اور ہر نبی نے اپنی بعثت پر آپ کی تشریف آوری کی خبر دی نیز لوگوں کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دے کر اس کی تکمیل فرمائی۔ پھر جملہ مخلوق میں سے ان لوگوں کو حسب حیثیت یہ نعمت عظمیٰ نصیب ہوئی جو انبیاء پر ایمان لائے اور ان کا اتباع اختیار کیا۔ جو اس سے محروم رہے انہیں ہمیشہ کے لیے محروم قرار دے دیا گیا اور یہ محرومی دوزخ کی آگ سے بھی اشد تر ہے چنانچہ کفار کے بارے ارشاد ہوتا ہے۔

کہ دوزخ میں تو جائیں گے ہی اس پہ مزید یہ کہ اللہ ان سے کلام بھی نہیں فرمائے گا۔ سو رمضان المبارک ایک ایسا کورس یا تربیتی پروگرام ٹھہرا جس میں انسان کو باوجود بشری تقاضوں کے فرشتوں جیسی طہارت واطاعت اختیار کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے کہ نہ کھانا فرشتوں کے اوصاف میں سے ہے چنانچہ مومن ایک مقررہ وقت سے لے کر مقررہ وقت تک کھانے پینے مباشرت وغیرہ سے رک جاتا ہے۔ نیز اطاعت میں بھی کمال حاصل کرتا ہے کہ باوجود شدت پیاس کے پانی نہیں پیتا۔ کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ سخت پیاس ہو۔ ٹھنڈا پانی موجود ہو مگر پیتا نہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ اللہ دیکھ رہا ہے گویا طبعاً بھی اور عملاً بھی اوصاف ملکوتی کے حصول کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسے اصطلاح تصوف میں مجاہدہ اضطراری کہا جائے گا کہ حکماً یہ مجاہدہ کرایا جا رہا ہے۔ اب دوا کوئی اپنے ہاتھ سے پی لے یا زبردستی پلا دی جائے اثر کرتی ہے۔ ایسے ہی مجاہدہ اختیاری ہو یا اضطراری اثر ضرور کرتا ہے۔

ہاں پرہیز شرط ہے۔ نیز جیسا کہ احادیث مبارکہ میں جا بجا ارشاد ہے کہ روزہ مکمل رکھے۔ نہ یہ کہ صرف شکم پری سے باز رہے۔ بلکہ زبان، کان، آنکھ اور ذہن و دل تک کا روزہ ہو۔ زبان کو فحش کلامی سے، آنکھ کو غلط نگاہی سے، ذہن کو برائی سوچنے سے اور دل کو بری خواہشات سے روکے اور روکنے کی پوری کوشش کرے۔ یہاں یہ گمان نہ کیا جائے کہ وساوس سرے سے آئیں گے ہی نہیں۔ اگر آئیں گے ہی نہیں تو روکے گا کس کو۔ ہاں محنت کرنے سے اگر دوام حضور نصیب ہو جائے تو پھر یہ کیفیت بھی ممکن ہے۔ اسی طرح یہ امید بھی فضول ہے کہ جہاں میں کوئی برائی نظر ہی نہ آئے۔ بلکہ اسے اپنی نگاہ کو روکنا ہے۔ ایسے ہی ارشاد نبوی ہے کہ "اگر کوئی تمہیں گالی دے تو اسے کہو کہ میں روزے سے ہوں۔" یا فرمایا کہ "کوئی جھوٹ بولنے سے زبان کو نہ بچالے تو اللہ کو اس کے بھوکا رہنے کی پرواہ نہیں"۔ یاد رہے میں احادیث مبارکہ کا مفہوم نقل کر رہا ہوں۔ ترجمہ لفظی نہیں۔ سو اس ساری محنت کے ساتھ رمضان المبارک کی برکات بھی ہیں۔

جس کسی نے ایمان اور احتساب سے یعنی حضور قلب سے روزہ رکھا یا رمضان میں قیام کیا تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ماسٹر سرور شاہ صاحب کوہاٹ کے بھائی حاجی مقصود شاہ صاحب وفات پا چکے ہیں، ساتھیوں سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

رانا قدیر احمد کے والد صاحب رانا محمد جمیل مورخہ ۲۷/۱۱/۸۸ کو انتقال کر گئے ہیں۔ ان کی دعائے مغفرت کے لیے ساتھیوں سے درخواست ہے۔

ہمارے ساتھی صوبیدار عبداللطیف صاحب برضا الٰہی پچھلے جمعۃ المبارک کو وصال پا گئے (منگلا میں) دعائے مغفرت کے لیے استدعا ہے۔

گئے۔ یعنی اسے طہارت و پاکیزگی میں ایک خاص درجہ نصیب ہوا اور فیوضات و تجلیات باری کو پانے اور حاصل کرنے کی ایک خاص استعداد حاصل ہوئی۔ ایسے ہی لیلۃ القدر کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہزار مہینہ سے افضل ہے۔ یعنی ہزار ماہ مسلسل بغیر انقطاع کے کوئی صرف اور صرف عبادات میں گزار دے تو لیلۃ القدر میں عبادت کرنے والا حصول طہارت یا برکات میں اس سے بڑھ جاتا ہے گویا اس سے بڑھ جاتا۔ یہ کم از کم درجہ ہے۔ کتنا بڑھ جاتا ہے یہ ہر ایک انسان کا اپنا درجہ ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا کہ مناسب ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ رات آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اور یہ بھی جان لیں کہ یہ ایک رات بیک وقت روئے زمین پر نہیں ہوتی بلکہ مختلف آبادیوں میں مختلف اوقات میں ہو سکتی ہے۔ بندہ عاجز نے کہیں پڑھا کہ حوالہ یاد نہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور خود تجربۃً بھی دیکھا کہ بعض اوقات بالکل قریبی شہروں میں بھی کبھی کبھار ایک شہر میں ایک رات میں جلسے برستے ہیں تو دوسرے شہر میں دوسری رات کو۔ شاید یہ بھی رحمت لٹانے کا ایک انداز ہے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے کہ پہلا عشرہ رحمت، دوسرا بخشش اور تیسرا دوزخ سے رہائی کا ہے۔ منادی پکار پکار کر دعوت دیتا ہے کہ آؤ اور رحمت باری سے دامن بھر لو۔ ایسے ہی دوسرے عشرے میں اعلان ہوتا ہے کہ بخشش چاہنے والو کہ تمہیں بخشش سے نوازا جائے۔ اور تیسرے عشرے میں دوزخ سے رہائی کے پروانے بٹتے ہیں۔ پھر اس قدر عظیم جود و سخا کے ساتھ۔ مزید کرم یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی ہے کہ سرکش شیاطین اور جن جکڑ دیئے جاتے ہیں، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ قید رکھے جاتے ہیں۔ نیز دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہاں ایک بات کھٹکتی ہے جب شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں تو پھر رمضان المبارک میں برائی کیوں ہوتی ہے۔ تو عرض ہے کہ انسان اگر نیکی کرے تو بشری کمزوریوں کے باوجود فرشتوں سے بڑھ کر پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے اور تجلیات ذاتی سے اس کا دل منور ہوتا ہے۔ جن کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ ارض و سما برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے لیکن اگر برائی کی راہ پر گامزن ہو تو جس قدر ذات نورانی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی قدر شیاطین کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے جب ادھر سے رشتہ منقطع ہو کر پوری طرح ابلیس سے پیوست ہو جاتا ہے۔ اس درجے والا شیطان کی فطرت کو اپنے قلب میں سمو لیتا ہے۔ اور پھر وہ خود شیطان ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے شیاطین الجن والانس: فرما کر دونوں طرف کے شیطانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور سورہ ناس میں ان دونوں کے وساوس سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ سو ایسے لوگوں کو شیطانی پیغام بھی القا ہوتے ہیں۔ یعنی جنہیں شیطان کی دوستی یا ولایت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے دلوں پہ اس کی باتیں القا ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کی علم موجودگی میں وہ اس کا کام کرتے ہیں خود برائی کرتے اور دوسروں کو برائی کی دعوت دیتے ہیں اور اس طرح خود تباہ ہو کر نسل انسانی کو تباہی میں دھکیلتے رہتے ہیں۔

سو ایک صوفی کو ان جملہ امور پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اور سحر و افطار کے اوقات کا خاص اہتمام چاہیئے۔ اسی طرح جن امور سے روزہ فاسد ہوتا ہے ان سے بہت زیادہ احتیاط رکھے۔ حتیٰ کہ مکروہات روزہ کو دھیان میں رکھے اور دل و نگاہ کو قابو میں رکھے بلکہ مناسب یہ ہے کہ بغیر ضرورت باہر نہ نکلے۔ نہ فضول بات زبان سے نکالے بغیر نیز تلاوت اور ذکر اذکار میں خوب دل لگا کر محنت کرے کہ شاید پھر یہ بابرکت مہینہ اور بابرکت موقع نصیب بھی ہو کہ نہ ہو۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ سحری و افطاری اور تراویح کے سبب ذکر اذکار چھوٹ جاتے ہیں۔ یا ان میں کمی آ جاتی ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے بلکہ ان تمام امور کے ساتھ محنت سے ذکر کرنا چاہیئے۔ اور دل کی جلا اور سینے کی روشنی کا اہتمام کیا جائے۔

حسب حیثیت صدقہ دیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجود الناس تو تھے ہی مگر رمضان المبارک میں آپؐ کی سخاوت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ نیز اگر ممکن ہو تو اعتکاف ضرور کیا جائے کہ اس میں فوائد عظیم حاصل ہوتے ہیں۔ روزہ بھی اور دن رات مسجد میں قیام اور ہمہ وقت ذکر۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ جو صرف اسی مبارک مہینہ میں نصیب ہو سکتی ہے۔

عجمی تمدّن

شاہ ولی اللہ دھلوی

فارس و روم کی حکومتیں صدیوں سے ایک ہی خاندان میں چلی آ رہی تھیں۔ اقتدار کے اس طویل عرصے نے انہیں بعض خرابیوں کا خوگر بنا دیا تھا ان میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ حکمرانوں کو اقتدار کے نشے نے دنیاوی لذتوں اور آرام و آسائش اور عیش و عشرت کا غلام بنا دیا تھا اور ان کی اس ناعاقبت اندیشی نے ان کی فکر و ذہن کو شیطان کے حوالے کر ڈالا تھا وہ ان عیش پرستیوں اور عیش کوشیوں کے ایسے دلدادہ ہوئے کہ بس ان ہی کے ہو کر رہ گئے ان بادشاہوں کی اس احمقانہ روش سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے دنیا بھر کے "اعلیٰ دماغ" ان کے حاشیہ بردار بننے لگے اور اس طرح ان کے افکار اذہان بھی سب طرف سے کٹ کر اس بات کے ہو گئے کہ اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کر کے اپنے آقاؤں کے آرام و آسائش، عیش و عشرت اور نمود و نمائش کے سامان فراہم کریں انہیں عیش پرستیوں کے نئے سامانوں اور نئے طریقوں سے آگاہ کریں۔ یہ ایک مسلم قاعدہ ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم، یعنی رعایا اور عوام اس راہ پر چلتے ہیں جس پر ان کے حکمران اور اہل اقتدار چلتے ہیں چناں چہ یہی ہوا اور ہوتے ہوتے بڑوں کی یہ خصلتیں عوام میں بھی عام ہونے لگیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاشرہ اس گرداب میں گھر کر رہ گیا ہر چھوٹے بڑے کی مساعی کا یہ مدعا ہو گیا کہ وہ کس طرح ان اسباب کا مالک بن جائے جن کی موجودگی میں وہ اس معیار کی زندگی گزار سکے جس کا چلن سارے ملک میں عام ہوتا جا رہا تھا۔ اب اگر ان میں باہمی مسابقت کا کوئی میدان تھا تو یہی کہ کون زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرتا ہے اور کون زیادہ شان و شوکت سے زندگی گذارتا ہے قدر و منزلت اس کی ہوتی جو اس میدان کو سر کر لیتا غیرت و حمیت اور ناموس کو اگر اس بازی کے جیتنے کے لیے داؤں پر لگانا ضروری ہوتا تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن جو بدقسمتی سے ان کے حصول کی راہ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکتا، دنیا بھر کی ذلتیں اس کا مقدر ہوتیں جو اس مفروضہ معیار سے جتنا کم ہوتا، اتنا ہی ذلیل اور بے عزت خیال کیا جاتا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی سرکاری افسر یا معزز شہری ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا کپڑا استعمال کرتا یا اس کی دستار اس سے کم داموں کی ہوتی یا اگر اس کے پاس رہنے کو پر شکوہ محل نہ ہوتا، شاندار باغ اور عالی شان حمام اور تفریح گاہ نہ ہوتی، یا اگر اس کا دسترخوان اعلیٰ درجے کے کھانوں سے نہ سجایا جاتا، تو کسی بھی حال میں وہ قابل احترام نہ ہوتا اور اسے حقیر و کم تر خیال کیا جاتا یہ محض مبالغہ نہیں ہے بلکہ آج بھی بچی کھچی بادشاہتوں کے درباروں میں ان خرابیوں کا کسی نہ کسی درجے میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ خرابیاں یہاں تک بڑھیں کہ کل جو اشیاء و سامان آرائش و آسائش میں شمار ہوتی تھیں، اب ضروریات زندگی کی فہرست میں داخل سمجھی جانے لگیں اور ان کے حصول کی جدوجہد بالکل اسی طرح ہونے لگی جیسے لوازم حیات اور ضروریات زندگی کے لیے ہو سکتی ہے

یہ لوگ اس بری طرح ان کے ذہنوں اور افکار پر سوار ہوگیا تھا کہ اس نے ان کے تمام فکری قویٰ کو معطل کر کے رکھ دیا ان اشیاء کے حصول کی خواہش کو ان کے دلوں سے دور کرنا اتنا مشکل تھا جتنا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا پھر یہ مصیبت تنہا کسی ایک فرد کسی ایک خاندان کسی مخصوص گروہ پر ہی نہیں آئی تھی بلکہ اس نے سارے معاشرے کو گھن لگا دیا تھا یہ ایک ہمہ گیر وبا تھی جس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی اور جس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا معاشرے کا کوئی فرد بھی نہ تو اس سے بچ سکتا تھا اور نہ بچ سکا کیا تاجر اور کیا صناع کیا امیر اور کیا غریب سب کو ایک ہی دھن تھی اور سارے کے سارے اسی چکی کے پاٹوں تلے پس رہے تھے اس وبا نے انہیں اس بری طرح جکڑ لیا تھا کہ انہیں اس بات کا بھی ہوش نہیں رہا کہ اس طرح

انہوں نے خود کو اپنے ہی ہاتھوں مصائب و آلام کے ایسے پہاڑوں تلے دبا لیا تھا، جن کو ٹالنا ان کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی معاشرہ اپنی زندگی کا معیار اس حد تک بڑھا لے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیارات تک پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کمائے۔ کیوں کہ یہ تمام لوازم کثیر دولت اکٹھی کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے اہل اقتدار نے دولت سمیٹنے کی ترکیب یہ نکالی کہ اپنے محکوموں اور شہریوں پر بھاری ٹیکس لگائے اور ان کے نتیجے میں عوام پر جو مصیبت ٹوٹی اس نے ملک کا معاشی نظام درہم برہم کر ڈالا خاص کر کسانوں، صناعوں اور تاجروں کی کمر ٹوٹ گئی اس پر ہی بس نہیں بلکہ اس خیال سے کہیں سر اٹھانے کی مہلت نہ مل جائے ان سے موقع بے موقع مختلف حیلوں سے جرمانے اور تاوان بھی وصول کئے جاتے اگر وہ ان کی ادائیگی سے انکار کرتے تو گرفتار ہوتے قید و بند کی مزید مصیبتیں جھیلتے اور کبھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے یا پھر غلام بنا کر فروخت کر دیئے جاتے لیکن اگر وہ ان سارے مصائب سے ڈر کر ان کے آگے سر تسلیم کر دیتے تو پھر ان کی حالت اس چوپائے کی طرح ہو جاتی، جسے اس کا مالک کھانے پینے کو اگر کچھ دیتا ہے تو اس کی غرض صرف اتنی ہوتی ہے کہ جانور کام کرتا ہے اور مالک کا لادا ہوا بوجھ ڈھو سکے

جب حالات ایسے اور مصائب کی یہ حالت ہو تو پھر کس سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ذرا دیر ہی کے لیے سہی، گردن اٹھا کر دوسری دنیا کی طرف دیکھ لیتا ہے دنیا کی زندگی جب اس طرح بندھنوں میں جکڑ دی جائے اور وسائل بھی سارے کے سارے کلیتاً ظالموں کے ہاتھ میں ہوں تو پھر سعادت اُخروی کا خیال کیسے آسکتا ہے اور کیسے آئے؟ کسی کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا کہ اپنی اور اپنے خاندان کی اُخروی بھلائی کے بارے میں کوئی فکر کر سکے اور اس بارے میں کچھ سوچ سکے ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے کا ہر طبقہ اور ہر گروہ فکر آخرت سے صدیوں بلکہ قرنوں کی مسافت پر رہ گیا لوگوں کی اس عام بدبختی کا حال یہ تھا کہ بڑی سے بڑی مملکت کی حدود میں ایک متنفس بھی ایسا نہ ملتا تھا، جسے اپنی عاقبت کا خیال آتا، ہو جو دین و مذہب کے بارے میں کچھ سوچتا ہو یہ تو دین کا نقصان تھا دوسری طرف چونکہ صناع اور کاریگر سب اس بات پر مجبور تھے کہ اپنی محنت و مشقت اور صلاحیتیں صرف ایسی چیزوں پر صرف کریں جن کی لوگوں میں کھپت کا سامان ہو سکتا تھا، اور کھپت صرف ان اشیاء کی تھی جو عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے سلسلے میں کام آسکتی ہوں نمود و نمائش کے استعمال ہو سکتی ہوں اس لئے ان کی توجہ ان امور کی طرف سے ہٹ گئی، جن کی تکمیل پر ایک صحت مند انہ معاشرہ انحصار کرتا ہے دوسری مصیبت یہ تھی کہ جو لوگ بڑوں کی طرح داد عیش دینے پر قادر نہ ہوتے تھے، وہ اپنی ساری توجہ اس بات پر صرف کرتے تھے کہ کسی طرح ان کے طرز زندگی کی نقل اتارنے ہی کے قابل ہو جائیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے رہن سہن کو ان جیسا بنا لیں، لباس مکان اور دیگر ضروریات زندگی کو مقبول عام معیار کے مطابق بنا لیں کیوں اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پھر ان کے لیے اس معاشرے میں کوئی مقام نہ ہوتا

اس طرز زندگی کے لوازم میں یہ بھی شامل تھا کہ بادشاہوں اور امراء کے دربار ہوتے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے جو ان کی دربار داری کے فرائض انجام دیتے چنانچہ ان کے حاشیہ نشینوں کی ایک فوج تیار ہو گئی۔ ان کا کام صرف اس قدر تھا کہ ان کی شان میں قصیدے کہتے ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے، انہیں اس بات کا یقین دلاتے کہ ہماری زندگیاں آپ کے لیے وقف ہیں اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عین صواب ہے اور جس تہذیب کو وہ پھیلا رہے ہیں عین تقاضائے وقت ہے نیز یہ کہ شاہی رسوم و رواج کو مروج کرنے کے سلسلے میں بادشاہوں کو ان کی خدمات کی ضرورت ہے ان کی احمقانہ شاہ خرچیوں کی تعریف و توصیف

کرتے اپنی خدمات جتا جتا کر ان سے انعام واکرام حاصل کرتے اور بلاواسطہ ملک بھر کے لوگوں کی کمائیوں کو یوں اپنا حصہ بناتے ان میں کچھ شعرا بھی ہوتے، جو اشعار کے ذریعے بادشاہ، اس کے امرا اور وزرا کو خراج عقیدت پیش کرتے اور صلہ پاتے ان کے علاوہ بھی اور لوگ مختلف بہروپ بھرتے اور خود کو اس طرح بادشاہوں کے آگے پیش کرتے کہ وہ انہیں کچھ دینا ضروری خیال کرتے۔

یہ خرابیاں صرف مالی مسائل ہی پیدا کرنے کا سبب نہیں بنیں بلکہ انہوں نے قوم کی اخلاقی قدروں کو بھی مسمار کر دیا معاشرے میں ان کی وجہ سے ایسی اخلاقی بیماریاں پیدا ہونے لگیں، جو روز افزوں اور جان لیوا تھیں ان بیماریوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نیکی سے دور ہوتے چلے گئے یہ خرابیاں جب پورے عروج پر پہنچ چکیں تو سارا ملک ایک گندے تالاب میں تبدیل ہو گیا اس تالاب سے سیر ہونے والی زندگیاں جھلستی چلی گئیں اور خدا کی زمین بنجر ہوتی گئی ادھر مشیت الٰہی نے حالات کو بدلنے کا تہیہ کر لیا تاکہ خدا کے بندوں کو اس عذاب سے جس میں وہ نادانستہ طور پر اور خواہی نہ خواہی مبتلا کر دیئے گئے تھے چھٹکارا ملے خدا جس نے اس کائنات اور اس کے بسنے والوں کو پیدا کیا ہے اس بدنظمی اور شرف انسانیت کی اس ارزانی پر راضی نہ تھا چنانچہ اس رحمان و رحیم نے اس حال کو ایک بہتر حال میں بدلنے کا فیصلہ فرمایا اور عالم کے نجات دہندہ کو عرب کی سرزمین میں وجود بخشا یہ خداوند تعالیٰ کی رحمت تھی، جو اس حسد لوزانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے اپنے اس نبی ؐ کے ذریعے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ اس شجر خبیث کی جڑیں ہی کٹ جائیں جو ان زہریلے اور کڑوے کسیلے پھلوں کی پیدائش کا سبب تھا۔

آپ ؐ کی ولادت اور آپ ؐ کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی، جس پر اس عجمی تمدن کا کوئی اثر نہیں تھا آپ ؐ اہل عجم کی مخالطت اور مجالست سے محفوظ رکھے گئے یہی نہیں، بلکہ آپ ؐ نے کسی بھی انسان سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس زمانے میں اہل عرب، ایران اور فارس سے ایسے تعلقات نہیں رکھتے تھے جن کی بنا پر ان کی تہذیب اور زندگی کے تکلفات اور تصنع سے متاثر ہو سکتی تھی اور ان کے رسوم و رواج بھی عربوں تک نہیں پہنچے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان تمام امور سے اس لیے محفوظ رکھا گیا کہ خدا تعالیٰ آپ ؐ کو ایک ایسی کسوٹی بنانا چاہتا تھا جو دنیا بھر کے لیے حق و باطل کا معیار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو احکام اپنے رسول ؐ پر نازل فرمائے ان میں اہل عجم کی عادات و رسوم سے بچنے کی خاص طور پر تلقین کی گئی ہے بلکہ حضور ؐ نے اپنی امت کو ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان کی عادات و اطوار کے اختیار سے منع فرمایا۔ ان کے رسم و رواج کی برائیاں خوب کھول کھول کر سمجھائیں اور مجموعی حیثیت سے دنیاوی زندگی میں انہماک اور لذت و شہوت کی اتباع کو ناجائز بنایا۔ آپ ؐ نے اس بات کی تعلیم بھی دی کہ انسان کی زندگی موت کی حدوں سے محدود نہیں ہے۔ آخرت کی زندگی پر ایمان ضروری قرار دیا گیا، اور ہر اس بات سے مسلمانوں کو روکا گیا جو آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی میں انہماک بڑھاتی ہے۔ اہل عجم لباس و طعام میں جن امور کے عادی تھے، حضور ؐ نے اپنی امت کو ان سے سختی سے منع فرمایا۔ آپ ؐ کی لائی ہوئی شریعت میں اسی لیے ریشم و دیبا اور منقش اور مزین کپڑے کے لباس کا استعمال ممنوع ہے۔ آپ ؐ نے مردوں کو گہرے اور شوخ رنگ کا لباس استعمال کرنے سے، سونے چاندی کے زیور پہننے سے اور تمام مسلمانوں کو سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے سے منع فرمایا۔ نیز مکانوں کی دیواروں کو منقش کرنے اور ان کی زینت سے روکا۔ ان تمام پابندیوں سے مقصود یہی تھا کہ آپ ؐ فی الحقیقت اس تہذیب کے سارے نشانوں کو مٹا دینے کے لیے تشریف لائے تھے، وہ تہذیب جس نے انسان کی زندگی کو اس کے لیے عذاب اور وبال بنا دیا تھا۔

خدا نے اپنے نبی کو ایسی حکومت عطا فرمائی جس نے ان بادشاہوں کی حکومتوں کو زوال کا منہ دکھایا۔ آپ ؐ کی ریاست نے ان کی ریاست کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا۔ یہ محض ایک پیش گوئی نہ تھی کہ

اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ

واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ

"کسریٰ ہلاک ہوگا اور ایسے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اسی طرح قیصریت کو ایسا زوال آئے گا کہ اس کا نام لینے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔"

بلکہ یہ ایک خدائی فیصلہ تھا جو پورا ہو کر رہا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ عادتیں اور خصائل جو ان عجمی ملکوں میں عام تھے، خدا کی نظروں میں کس قدر غیر پسندیدہ تھے اور جنہیں مٹانے کے لیے اس نے ان ملکوں کی فنا اور تباہی کا فیصلہ فرمایا۔

رحمت و مغفرت کا مہینہ

حافظ عبدالرزاق

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ شعبان کے آخر میں ایک طویل خطبہ دیا جس میں حضور اکرمؐ نے رمضان المبارک کی فضیلتوں اور برکتوں کا بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

یہ وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ جہنم کی آگ سے آزادی ہے"

حضور اکرمؐ کے اس بیان میں ایک تکوینی حقیقت کیطرف اشارہ کرکے یہ سبق دیا کہ روحانیت کی دنیا میں بھی یہی اصول کارفرما ہے مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں مختلف دنوں کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ رات اور دن کے اثر میں فرق ہوتا ہے۔ موسموں کے اثرات جدا ہوتے ہیں۔ اور یہ اختلاف محسوسات کی دنیا میں اتنا عام اور نمایاں ہے کہ ہر شخص اسے محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح روحانیت کی دنیا میں بھی وقت اور موسم کے بدلنے سے اثرات بدلتے رہتے ہیں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرکے حضور اکرمؐ نے رمضان المبارک کے اثرات کا تجزیہ فرمایا۔ آج کی مجلس میں اسی ماہ مبارک کے پہلے عشرے کی خصوصیات اور اس کے اثرات کا بیان ہو گیا۔ ارشاد نبوی ہے اول رحمۃ۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ رحمت کیا ہے رحمت کے دو پہلو ہیں ایک اس کی حقیقت دوسرا اس کے مظاہر۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے تجربات اور مشاہدات کی طرف نگاہ کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے اجسام میں بارش کو ہم رحمت کہتے ہیں وہ کیوں؟ اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں خزاں کا طویل موسم گزرتا ہے۔ زمین خشک درخت ٹنڈ منڈ سبزی کا کہیں نشان نہیں لیکن جونہی برسات شروع ہوتی ہے بہار کا موسم آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے ہر طرف زندگی انگڑائیاں لے رہی ہے ہر چیز سے حیات پھوٹنے لگی ہے۔ زمین کی سطح پر سبزہ اگنے لگتا ہے درختوں کے خشک شاخوں پر شگوفے پھوٹنے لگے ہیں۔ پھول کھلنے لگے۔ پرندے چہچہانے لگے۔ بات سمجھ میں آئی کہ رحمت کیا ہے؟ زندگی ہے شعور ہے رونق ہے بہار ہے۔

بعینہٖ اسی طرح رمضان المبارک کی آمد سے روح کی دنیا میں بھی زندگی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ وہ غفلت کوش انسان جو دنیوی بندھنوں میں جکڑے رہتے ہیں اور اپنے خالق کو بس بھلا ہی بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس مہینہ کے آنے پر اللہ کے گھر کا رُخ کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ مسجدوں میں رونق اور اور چہل پہل شروع ہو جاتی ہے یہ مہینہ اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم کی سالگرہ کا مہینہ ہے اس لیے جو لوگ سال کے گیارہ مہینے کبھی قرآن کھول کر بھی نہیں دیکھتے ان کے دلوں میں بھی تلاوت کا شوق ابھرنے لگتا ہے۔ مسجدوں میں نماز تراویح میں قرآن سنانے کے لیے حفاظ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ روح کی دنیا میں بہار آنے لگی ہے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ زندگی انگڑائیاں لینے لگی ہے۔ یہ رحمت کے مظاہر ہیں جس دل میں زندگی کی کوئی

رمق موجود ہوتی ہے وہ اس رحمت کو یقیناً محسوس کرتا ہے۔ ہاں جس شجر حیات کی جڑ کو ہی دیمک لگ چکی ہو وہ اس عالمگیر رحمت سے محروم ہی رہتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان المبارک کے مختلف حصّوں کے اثرات بیان فرماتے ہوئے اس مہینہ کے دوسرے عشرے کے متعلق فرمایا کہ واوسطہ مغفرۃ۔ یہ بالکل حقیقی فطری اور نفسیاتی ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ حضور اکرمؐ نے پہلے عشرے کو رحمت فرمایا۔ رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ احساس زندہ ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جب احساس زندہ ہو جائے تو انسان سب سے پہلے ماضی کے نقصان کی تلافی کی تدبیریں سوچتا ہے اور جب تک تلافی مافات نہ کرلے اسے سکون میسر نہیں آتا۔ چنانچہ وہ ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا ہے اور ہر ممکن کوشش کر ڈالتا ہے۔

اسی نفسیاتی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ رمضان کی آمد پر جب ایک غفلت شکار قلب میں زندگی کا رویہ بدلنے کا احساس پیدا ہوا تو لازماً اس کا ماضی فلم کی ریل کی طرح اس کے سامنے آجائے گا اسے قدم قدم پر اور جا بجا غفلتوں کا ایک صحرا نظر آئے گا۔ اپنے خالق سے دوری کا منظر سامنے آئے گا اپنے مالک کے احکام سے بے اعتنائی بے توجہی اور کبھی دانستہ مخالفت کے مناظر بھی سامنے آئیں گے۔ اس موقع پر نفسیاتی اعتبار سے اس کا ردِعمل کیا ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ تلافی مافات کے بغیر اور کیا ہو سکتا ہے اس لیے لازماً اس کے دل میں یہ جذبہ بیدار ہو گا کہ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ اسے اپنے ماضی پر ندامت ہو گی۔ آئندہ کے لیے صحیح روش اختیار کرنے کا عزم ہو گا۔ مگر یہاں پھر ایک اور خطرناک موڑ آتا ہے وہ یہ کہ میں معافی تو مانگوں مگر اس کی کیا خبر اور کیا ضمانت کہ معافی ملے گی یا نہیں۔ اس مقام پر سہارا دینے کے لیے اور سنبھالنے کے لیے ارحم الراحمین کی طرف سے رحمتہ اللعالمین کی زبان سے یہ مژدہ جانفزا ملا کہ یہ مہینہ تو گویا مغفرت کا موسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب موسم برسات کا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ بارش نہ برسے۔ جب بہار کا موسم آجائے تو کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ زمین سے سبزہ نہ اگے۔ درختوں کی شاخوں سے پتے نہ پھوٹیں، باغ و راغ میں رونق نہ آئے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جب مغفرت کا خاص موسم آجائے تو مغفرتِ عامہ میں کوئی کمی رہ جائے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس خزینۂ مغفرت سے حصّہ وافر انہی کو ملتا ہے جو خوابِ غفلت سے جاگ اُٹھیں۔ جن کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔ اور رحمت کے موسم میں ان کا احساس بیدار ہو چکا ہو۔ ان کی آنکھیں ہی نہیں دل جاگ اُٹھتے ہیں۔ اور بیدار دل کی خاصیت یہ ہے کہ اسے نفع و نقصان کی تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقصان کی تلافی کے لیے یہ بیدار دل اتنا بے قرار ہوتا ہے کہ کوئی لمحہ تلافی مافات سے غافل نہیں ہوتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس فرصت کے وقت اور مغفرت کے موسم کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو اپنے رحیم و کریم مالک سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگتے ہیں

آتش دوزخ سے آزادی کا مہینہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان المبارک کی خصوصیات بیان فرماتے ہیں اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کی ایک مستقل خاصیت کا بیان فرمایا۔ پہلے دو عشروں کی خصوصیات اور ان کے اثرات کا بیان ہو چکا کہ پہلا عشرہ رحمت کا موسم ہے۔ دوسرا مغفرت کا تیسرے عشرے کے متعلق فرمایا کہ واٰخرہ عتق من النار یعنی آخری عشرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن جب اس کے تقاضے پورے کرے تو اس کے لیے جہنم سے آزادی کی بشارت دے دی گئی ہے۔

ان خصوصیات میں وہی فطری، عقلی اور نفسیاتی ترتیب پائی جاتی ہے جو پہلے دو عشروں میں ملتی ہے۔ انسان کی سعادت بلکہ شرف انسانیت یہ ہے کہ اگر انسان تقاضائے بشریت کے تحت غفلت میں مبتلا ہو گیا ہو تو اس دلدل سے نکلنے کی ضرورت یہ ہے کہ اول احساس زیاں پیدا ہو پھر تلافی مافات کا ارادہ اور جذبہ ابھرے پھر ان تمام خوبیوں کو سمیٹا جائے کہ فلاح و کامرانی کی معراج تک پہنچ سکے۔ پہلے دو عشرے احساس زیاں اور تلافی مافات کے لیے گویا مختص تھے۔ اس عشرے میں دو جذبے ابھرتے ہیں اول ہر وہ کام جو جہنم کی طرف لے جانے والا ہو۔ اس سے بچنا۔ اور ہر وہ کام جو جنت کی طرف جانے کا راستہ ہموار کرے اسے اختیار کرنا۔ اب ان کی کیا عمدہ تدبیر بتائی گئی ہے مثلاً رمضان کے

آخری عشرے میں اعتکاف بیٹھنا سنت ہے۔ اعتکاف کی حقیقت کیا ہے؟ معتکف زبان حال سے یوں کہتا ہے کہ اے میرے رحیم وکریم مولا میں نے تیرے حکم کی تعمیل میں دن بھر حلال اور طیب رزق بھی اپنے پیٹ میں نہیں جانے دیا۔ اپنی زبان اپنی آنکھوں اپنے کانوں اپنے ہاتھ پاؤں کو حتی المقدور تیری نافرمانی سے روکا مگر اپنے گھر بار بیوی بچوں اور کام دھندے میں ضرور مشغول رہا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تیرے ساتھ تعلق استوار کرنے کا حق یوں ادا ہوتا ہے کہ سب سے توڑوں تجھ سے جوڑوں لے اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تیرے گھر میں ڈیرے ڈال دیے۔ اب تیرے دروازے سے اسی وقت اٹھوں گا جب سب محبتوں پر تیری محبت غالب آجائے گی۔

دوسری تدبیر یہ کہ منعم حقیقی نے انعام یہ دیا کہ اس عشرے میں ایک رات ایسی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ ہے کوئی ٹھکانا اس کی بخشش کا واقعی محنت کی اجرت دینا نہیں بلکہ استحقاق دینا اسی کو سزاوار ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ اس رات رب العالمین کی طرف سے منادی ہوتی ہے کہ ہے کوئی گناہوں کی معافی مانگنے والا کہ میں اس کے گناہ معاف کروں ہے کوئی رزق کی فراخی مانگنے والا کہ میں اسے اوروں سے بے نیاز کر دوں، ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کی جھولی بھر دوں

ع ہم تو سائل ہیں کرم ہیں کوئی سائل بھی تو ہو

اس پر مستزاد یہ کہ اعلان ہوتا ہے۔ روز خ میں لے جانے والی چیز گناہ ہی تو ہے اور گناہ کی معافی کا یہ عالم کہ کوئی سچے دل سے معافی مانگے تو ہم یوں معاف کرتے ہیں گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔ کتنا بدنصیب ہے وہ شخص جو یہ سودا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

ے: چند عنایات تیری ہوں تو گنی بھی جائیں
لطف کا سیل بہاتے تجھے دیکھا ہم نے

روزہ کی حقیقت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے باز نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔

قاعدہ ہے کہ ایک ہوتی ہے صورتِ شے اور ایک حقیقتِ شے۔ صورت کا تعلق نگاہ تک محدود رہتا ہے اور حقیقت کے اثرات دور دور تک پھیلتے ہیں۔ مثلاً مٹی کا بنایا ہوا ایک آم دیکھنے میں خوبصورت ہوگا ایک نادان بچے کو پسلایا جا سکے گا۔ مگر اس میں نہ گودا نہ رس نہ مٹھاس نہ ذائقہ نہ اثر نہ خاصیت۔ بس اسی طرح سے روزہ کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے۔ صورت یہ ہے کہ آدمی دن بھر نہ کھائے نہ پیئے اور افطار کے بعد خوب کھائے پیئے بغیر اس مقصد کے کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے یہ ہے روزہ کی صورت۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اول دن بھر کھانا پینا اس لیے چھوڑے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ پھر یہ میری بہتری کے لیے حکم دیا ہے پھر میری تربیت کے لیے حکم دیا ہے کہ انسان کی دو بڑی خواہشیں کھانے پینے اور جنس کی خواہش ایسی زبردست قوت ہے کہ انسان اس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بالکل خواہش کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے تو یہ کھانا پینا اس لیے چھوڑا ہے کہ مجھے خواہش کا بندہ بننے کی بجائے اپنے رب کا بندہ بن کر جینے کا سلیقہ آجائے اس جذبے سے اگر کھانا پینا چھوڑا ہے اور کھانے کے وقت کھایا ہے تو یقیناً روزے کی حقیقت کی بنیاد رکھی ہے۔

اس کے بعد ایک طبعی عمل پر غور کرنے سے روزے کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے وہ یوں کہ غذا جب پیٹ میں جاتی ہے تو ہضم ہو کر خون کی شکل اختیار کرتی ہے وہ خون رگوں میں دوڑتا ہے اس سے قوت حاصل ہوتی ہے وہ قوت اعضا کو حرکت میں لاتی ہے اور انسان زندگی میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے غذا کا طبعی یا مادی پہلو اسی غذا کا ایک اخلاقی اور روحانی پہلو بھی ہے اگر صرف صورتِ روزہ ہے یعنی بلا مقصد یا رسماً کھانا پینا چھوڑا ہے تو اس سے جو قوت حاصل ہوگی وہ ایسے کاموں میں صرف ہوگی جو عبث ہیں یا نقصان دہ ہیں۔ اور اگر پورے اس شعور اور جذبے کے ساتھ کھانا پینا چھوڑا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا تو اس غذا سے جو قوت حاصل ہوگی وہ یقیناً ایسے کاموں کے کرنے میں صرف ہوگی جو اللہ کریم کو پسند ہیں اور ایسے کاموں سے رکنے میں صرف ہوگی جو اسے پسند نہیں۔ تو اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا پینا چھوڑنے رکھنے کی وہ صورت بیان فرمائی ہے کہ جس میں اتنی قوت بھی نہیں کہ اس دو انچ قد کے عضو یعنی زبان پر بھی انسان کو قابو حاصل نہ ہو سکے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھنے کی ایکٹنگ کرتا رہا حقیقت

میں اس نے روزہ رکھا ہی نہیں۔ اور صورت شے سے تو صرف ایک بھولے بھالے بچے کو بھلایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بڑا انقاد ہے اس کے سامنے تو حقیقی اور کھرا مال پیش کرنا چاہیئے۔ تو حضور اکرمؐ نے اس حدیث پاک میں یہ سبق دیا۔ کہ صرف پیٹ کا روزہ نہ رکھو بلکہ تمام اعضا کا روزہ ہو کہ سب کو اللہ کی نافرمانی سے روکے رکھو۔ تب صحیح معنوں میں روزہ ہو گا اور سیرت و کردار کی تعمیر ہو گی اور یہ جذبہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب دل میں ایمان کی جڑیں مضبوط ہوں۔

روزہ رکھنے کا سلیقہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔

قاعدہ ہے کہ کوئی کام صرف کر لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ سلیقہ سے کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اس حدیث پاک میں حضور اکرمؐ نے روزہ رکھنے کا سلیقہ سکھایا ہے جس کے دو اجزاء ہیں۔ اول ایمان۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نیت اور اس ارادہ سے رکھے کہ ایسا کرنا خالق کائنات کا حکم ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور بندے کا کام اطاعت کرنا ہوتا ہے لہٰذا اگر میں روزہ نہ رکھوں تو میرا شمار اس کے بندوں میں نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات شرف انسانیت کے منافی ہے کہ انسان ہو اپنے خالق کی بندگی سے منہ موڑے جب کہ نچلے درجے کی ساری مخلوق جمادات ہوں یا نباتات و حیوانات اس کی بندگی سے سرمو انحراف نہیں کرتے پھر اس یقین کے ساتھ روزہ رکھے۔ کہ ایسا کرنے سے میرا رب مجھ سے راضی ہو گا اور میرے قلب کا تعلق اپنے رب سے جڑا رہے گا۔ یہ ایمان کا ایجابی پہلو ہے۔ اور سلبی پہلو یہ ہے کہ اس لیے روزہ نہ رکھے کہ اسکی صحت ٹھیک ہو گی۔ یا نکو بننے سے بچ جاؤں گا یا لوگوں میں نیک ہونے کی شہرت ہو گی یا بچت ہو گی وغیرہ۔

دوسرا جزو ہے احتساب۔ احتساب یہ ہے کہ آدمی اس امر کا خیال رکھے اور جائزہ لیتا رہے۔ کہ میں نے بھوکا پیاسا رہنا قبول کیا ہے حالانکہ میرے پاس حلال اور طیب مال موجود ہے تو کیوں۔ صرف اس لیے کہ میں خواہشات کا بندہ بن کر ڈنگروں ڈھوروں کی طرح زندگی بسر نہ کروں بلکہ اللہ کا بندہ بن کر رہنے اور خواہشات پر قابو پانے کا سلیقہ آ جائے۔ یعنی جو خواہش مجھے اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جانے والی ہو میں اسے پورا کرنے سے صرف اس لیے رک جاؤں کہ میرا رب اسے ناپسند کرتا ہے۔ احتساب یہ پہلو ابتدائی اور ضابطے کی کارروائی کا پہلو ہے۔ احتساب کا دائرہ وسیع ہے جب بھوکا پیاسا رہنے کا مقصد یہ ہے کہ خواہشات پر قابو پانے کا ڈھنگ آ جائے تو خواہش کا دائرہ عمل صرف پیٹ تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ تو بہت وسیع ہے اس لیے احتساب کا عمل بھی وسیع ہے۔

مثلاً میری نگاہیں اگر غلط مناظر کی طرف اٹھنا چاہتی ہیں تو میں انہیں اس طرف اٹھنے سے روک لوں۔ میرے کان اگر لتا کے گانے سننے میں لذت محسوس کرتے ہیں تو میں اس سے انہیں روک لوں۔ میری زبان اگر جھوٹ غیبت اور یاوہ کوئی بھی خواہش رکھتی ہے تو میں اسے ایسا کرنے سے روک لوں۔ میرے ہاتھ پاؤں ظلم زیادتی اور بے راہ روی کی طرف مائل ہوں۔ تو میں انہیں ایسا نہ کرنے دوں میرا دماغ اگر کسی غلط یا تخریبی سوچ کی طرف راغب ہے تو میں اسے ادھر سے روک کر کسی صحیح سمت رخ کر دوں۔ یہ ہے احتساب کی حقیقت اس سلیقے کے ساتھ جس نے رمضان کے روزے رکھے اسے نقد صلہ یہ ملے گا کہ اس کی سابقہ کوتاہیاں، لغزشیں، غلطیاں معاف کر دی جائیں گی۔ گناہوں کی معافی کوئی معمولی بات نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کیونکہ گناہوں کا معاف کر دیا جانا اس بات کی دلیل ہوئی کہ سزا سے معافی مل گئی۔ ایک مجرم کی اگر سزا معاف ہو جائے تو کیا وہ شکوہ کرتا ہے کہ مجھے انعام کیوں نہیں ملا۔ وہ جانتا ہے کہ سزا معاف ہو جانا ہی بہت بڑا انعام ہے مگر یہاں تو گناہ معاف ہو جانا صرف سزا کا معاف ہو جانا ہی نہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جانے کی بشارت بھی ہے۔ ہے کوئی جو اتنا نفع بخش کاروبار کرنے کے لیے آمادہ ہو۔

روزے کی برکات

حافظ عبدالرزّاق

۱ روزہ اللہ کریم نے شدتِ محبت کی وجہ سے مومنین پر فرض کیا۔

۲ روزہ جسمانی نشوونما کے لیے جتنا مفید ہے دنیا کے کسی سائنسدان کا کوئی فارمولا اس کے گرد ڈیڑھ حصے کو بھی نہیں پا سکا۔

۳ روزہ روحانی ارتقار کا ایک ایسا زینہ ہے جس سے آگے کسی دوسری چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۴ اللہ تعالےٰ کی مخلوقات میں بہترین مخلوق انسان، انسان میں انبیاء اور انبیاء کی روح رواں جان جاں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ روزہ دار تھے۔

۵ فرشتے تو غالباً اتنا لکھتے ہوں گے کہ سحری کو اٹھا، کھانا کھایا دن بھر روزے سے رہا۔ نمازیں پڑھتا رہا۔ لیکن یہ علم تو شاید ان کو بھی نہ ہو کہ وضو کرتے ہوئے جب ۵۰ ملی لیٹر پانی منہ میں ڈالا تو ۵۰ کا ۵۰ کلی کر کے گرا دیا یا کچھ حلق میں اتارہ گیا۔ یہ تو صرف وہ اقرب من حبل الورید ہی جانتا ہو گا۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

۶ روزہ نفس کے پُر وقار تزکیہ کرنے کے لیے فرض کیا گیا۔ ورنہ بدبخت لوگوں کی سرزنش کے لیے چرس، بھنگ اور دیگر خرافات کی مشیئت خداوندی نہ نافذ ہوتی۔

۷ روزہ ڈسپلن کا اتنا اعلیٰ درس دیتا ہے کہ اگر مومنین کے ذریعے دنیا اس سے روشناس نہ ہوتی تو جملہ قوانین و ضوابط کے باوجود انسان وحشی ہوتا۔

۸ پرلے درجے کا دہریہ بھی اگر انہی شرائط کے ساتھ جو ہمارے ہاں رائج ہیں روزہ رکھ لے تو اللہ تعالےٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ اسے دولتِ ایمان سے نواز دے۔

۹ دنیا بھر کے ہسپتالوں میں جہاں کہیں مسلمان مریض ہیں اگر ان کی بیماری کو خالص شرعی نقطہ نگاہ سے عذر ثابت کیا جائے تو درست ورنہ ان سے جبراً روزہ رکھوایا جائے۔ افطاری کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ وہ بیماری نہ تھی۔ بلکہ ان کے اپنے نفس کا فریب تھا۔

۱۰ وہ امیر لوگ جو کسی نہ کسی بہانے روزہ نہ رکھنے کے عادی ہیں اگر ان پر روزہ کی حقیقت واضح ہو جائے تو نڈھال ہو کر مر جائیں لیکن روزہ نہ توڑیں۔

۱۱ وہ مفلس لوگ جو کسی جہالت کے سبب اللہ تعالےٰ سے رزق کی کمی کے شاکی ہیں اگر ان پر روزہ کی مقصدیت واضح ہو جائے تو یہ خوشی سال کے زیادہ ایام میں روزہ رکھیں اور شکایت کے بجائے مزید شکر ادا کریں۔

۱۲ کسی بھی شعبہ کا مسلمان کمانڈر اگر پکا دیندار ہو تو اپنے ماتحت غیر مسلم ملازمین سے کسی حربہ کے تحت روزہ رکھوا لے اور رات کو اللہ کریم سے ان کے لیے طلب ایمان کرے تو اللہ کریم ضرور اس کی لاج رکھ لیں۔

سکونِ قلب

حضرت مولانا محمد اکرم

سورہ اعراف میں بیان کیا گیا کہ نفس نبوت انسانیت کے لیے کس قدر رحمت و برکت ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وطیرہ قوم کے ساتھ جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں کو اپنے نبی کے ساتھ کس طرح کا تعلق رکھنا چاہیئے۔ اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔

سورہ اعراف میں متعدد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر بیان کیا گیا ہے۔ اسی بات کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ہر نبی، ہر رسول ایک بنیادی بات جس کی طرف دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت کا استحقاق صرف اور صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات کو ہے عبادت کے لیے ہم نے صرف ان امور کو جو ہماری شریعت میں بطور عبادت مامور بہ ہیں انہیں مختص کر لیا ہے۔ حقیقتاً عبادات کا مفہوم یہ ہے کہ امید منفعت پہ یا دفع مضرت پہ کسی سے بچنے کے لیے یا کسی منافع کی اُمید پر انسان کے دو ہی پہلو ہیں یا تو اُسے یہ بات کہ اس کی اطاعت کر لوں، اس سے نہ بگاڑ دوں اگر میں نے اس سے بگاڑ لیا تو میرا یہ نقصان ہو گا یا اس کی اطاعت کر لوں اس سے نہ بگاڑ دوں اس کی بات مان لوں میرے لیے منافع ہو گا اسے جلبِ منفعت کہتے ہیں۔ اسے دفع مضرت کہتے ہیں۔ یعنی نفع کی امید پر یا نقصان سے بچنے کیلئے اگر کسی نے کسی بھی ہستی کا وہ حکم مانا جو اللہ کے حکم کے خلاف ہے تو اس نے اس کی عبادت کی۔

احکام الٰہی کے اندر رہ کر اگر کسی نے کسی کی بات مان لی تو اس نے اللہ کی بات مانی۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس کی اطاعت کرو۔ میرے نبی کی اطاعت کرو۔ استاد کا احترام کرو۔ چھوٹوں پر شفقت کرو۔ جن کاموں کا اللہ جل شانہٗ نے حکم دیا ہے ان کاموں کو کرنا یا ان باتوں کو سننا خود اللہ کریم کی بات ہو گی۔ صرف نماز روزہ ہی عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام جسے ہم جھوٹ بول کر پیسہ لیتے ہیں اللہ کریم منع فرماتے ہیں اور ہم رشوت لے کر دولت بڑھانا چاہتے ہیں۔ جلبِ منفعت پہ اگر اللہ کے حکم کو چھوڑ دیا جائے اور نفع اٹھانے کے لیے دولت جمع کرنے کے لیے اللہ کی نافرمانی اختیار کی جائے اسی کو اللہ کے سوا دوسری چیز کی یا کسی دوسرے فرد کی عبادت کو شرک کہا گیا ہے۔

جتنے مذاہب باطلہ اور گمراہ فرقے مذہب کے نام پر وجود میں آئے ہیں ان سب میں یہی بنیادی فلسفہ ہے کہ انسان کو مختلف منافع کا لالچ دے کر یا مختلف چیزوں سے ڈرا کر مختلف دروازوں پہ جھکاتے ہیں کبھی دیوی دیوتاؤں کے سامنے کبھی، مختلف فرضی طاقتوں کے سامنے، مختلف انسانوں کے سامنے، مختلف حکمرانوں کے سامنے۔

جب دنیاوی کاموں کے لیے اللہ کی اطاعت چھوڑ دیتے ہیں۔ دولت جمع کرنے کے لیے اللہ کی اطاعت چھوڑ دیتے ہیں کسی دوسرے کی خوشامد کرنے کے لیے تو ان سب امور میں دراصل ہم عبادات کر رہے ہوتے ہیں۔ اس ہستی کی جس کو راضی کرنے کے لیے یا جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہم اللہ کی اطاعت چھوڑ دیتے ہیں۔

اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کا جو بنیادی عنصر ہوتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ ہر طرح کی اطاعت جس پہ نفع کی امید بھی ہو اور جس کے صلے میں نقصان سے بچنے کا بھروسہ بھی ہو یہ سارے کا سارا جو ہے اس کا مستحق اکیلا اللہ ہے۔ اسی کی ذات پہ یہ امید بھی رکھو کہ ہر طرح کے نقصان سے بھی میری حفاظت وہی فرمائے گا اور ہر طرح کا منافع بھی مجھے وہی عطا فرمائے گا اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو اس بات پر یقین حاصل ہو جائے تو پھر سب کچھ چھوٹ سکتا ہے۔ لیکن اللہ کی عبادت اللہ کی اطاعت نہیں چھوٹ سکتی چونکہ وہاں صرف ثواب کا معاملہ نہیں رہتا۔ ہم نے عبادت کے ساتھ ثواب کا ایک فلسفہ تھی کر رکھا ہے۔

ثواب ایک ایسا لفظ ہے اس کے معانی اور مفاہیم سے ہم آشنا نہیں ہیں اس پہ مزید ایک زیادتی یہ کی جاتی ہے کہ یہ ہماری مجبوری ہے ثواب تو اگلی دنیا میں جا کر آخرت میں ملے گا۔ یہاں ثواب کو آپ نے کیا کرنا ہے۔ ثواب سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ ثواب کو آپ نے کھانا تو نہیں ہے ثواب کا لباس تو نہیں پہننا یہ تو بعد میں ملے گا۔

انسان جو مخلوق ہے محتاج ہے اسے رب جلیل حکم دیتا ہے کہ کسی سے اگر ضروری کرواتے ہو تو اس سے پہلے طے کر لو اور اس کی مزدوری فوراً ادا کر دو۔ اور خود ادھاری مزدوری کرواتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ایک دفعہ اللہ کو پکارے تو اس کی ایک پکار بھی ضائع نہیں جاتی۔ شرط یہ ہے کہ اس کے پکارنے میں بنیادی طور پہ وہ خلوص وہ عقیدہ یا وہ درد موجود ہو جو اللہ کو پکارنے کے لیے چاہیئے۔ اللہ کریم نے کرم فرمایا ہے کہ طریقہ اور سلیقہ اپنے نبی نے بتایا ہے جو عقیدہ ایمان ضروری ہے۔

اور ثواب سے وہی اجر مراد ہے جو ہماری اس دنیوی زندگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے اس پہ آخرت میں دو اجر مرتب ہوتے ہیں ایک فوری، ایک آخرت میں مرتب ہوگا اسی دنیا میں دنیوی منافع بھی ہوتا ہے۔ دنیا کی مصیبتیں بھی جھیلتی ہیں عزت و آبرو بھی نصیب ہوتی ہے قلبی سکون بھی نصیب ہوتا ہے اور اخروی مصائب بھی جھیلتے ہیں۔ آخرت کی عزت، آخرت کی سربلندی بھی نصیب ہوتی ہے ساری چیزیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات بعض

آئندہ کے پروگرام

- دورہ پشاور: (بعد از عید الفطر) ۸ مئی سے ۱۱ مئی ۸۹ء تک۔
- دورہ دوبئی، ابوظہبی: ۱۶ مئی سے ۱۹ مئی تک (قیام ۳ رات)
- دورہ انگلستان: ۱۹ مئی سے ۳۱ مئی تک۔ (قیام ۱۵ رات)
- دورہ امریکہ اور کینیڈا: یکم جون سے ۱۵ جون تک (قیام ۱۵ رات)
- حالیسی دار العرفان ۱۸ مئی کو متوقع ہے۔
- ہفت روزہ اجتماع دار العرفان: ۱۶ جون کو شروع ہو کر ۲۳ جون کو ختم ہوگا جس کے آخر میں حاضری مرشد آباد ہوگی۔
- دورہ کوئٹہ: ۲ جولائی سے ۸ جولائی تک۔

لوگوں کو تکلیف آجاتی ہے۔ بیماری بھی آتی ہے لیکن اگر نیکی کے ساتھ کوئی تکلیف آتی ہے تو شاید وہ تلافی مافات کے لیے ہو ہم اس پائے کی نیکی نہ کر سکے ہوں۔ جس پائے کی کرنا چاہیے اس میں کوئی کمی رہ گئی تو اللہ کریم نے وہ کسی بیماری یا کسی مجاہدے سے پوری کرادی یا کچھ غلطیاں ہوگئیں، کچھ کوتاہیاں ہوگئیں ان کی کمی کو پورا کر دیا۔

یا بعض درجات ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کریم کسی کو دینا چاہیں ان کے ساتھ بعض تکالیف جیسے شہادت ایک درجہ ہے، لیکن قتل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ دنیا دار جس کو آرام سمجھتے ہیں وہی آرام ہو۔ آرام ہر وہ کام آرام ہے جو دل میں روشنی، دل میں سکون پیدا کرے۔ تو اللہ کی طرف سے جو چیز آتی ہے۔ بظاہر وہ اگر دوسرے کو تکلیف بھی نظر آئے تو جس پہ وارد ہوتی ہے اس کے لیے اس میں سکون اس میں لذت اس میں لطف ہوتا ہے اور یہ تب نصیب ہوتی ہے جب آدمی کی اُمیدیں اللہ کریم سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ بنیاد ہوتی ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی۔

اور اس کا مقابلہ سب سے پہلے علماء کا طبقہ کیوں کرتا ہے یا وہ لوگ کیوں کرتے ہیں جو پیشوا بنے ہوئے ہوتے ہیں جو مقتدا بنے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگ نام تو اللہ کا لیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے نام پر اللہ کی جگہ بٹھا رکھا ہوتا ہے اور لوگوں سے اللہ کے نام پہ اپنی بات منواتے ہیں۔ انہیں اس لیے تکلیف ہوتی ہے کہ ہر آدمی بحیثیت مخلوق ایک احد لاشریک خالق کے سامنے برابر ہو جائیں تو ہماری کیا حیثیت رہ گئی اسلئے فرمایا تمام بڑے بڑے لوگوں نے کہا یہ تو بالکل گمراہی کی باتیں کرتا ہے یہ بھی کوئی بات ہے جو آپ کہتے ہیں ایسا بھی کبھی ہوا ہے یہ تو آپ درست نہیں کہہ رہے۔ یہ باتیں تو نری گمراہی کی ہیں یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی بات ہے اس طرح تو معاشرہ ہی ختم ہو جائے گا۔ کام چلے گا ہی نہیں۔ یہ تو چھوٹے بڑے کی تمیز ہی ختم ہو گئی۔

ایک دن میں دوپہر کو اٹھا ہوں اس دن بارش ہو رہی تھی باہر دو آدمی کھڑے تھے کہنے لگے ہمیں تعویز دیں۔ آپ، مجھ سے کیوں لیتے ہو۔ آپ کا اللہ سے تعلق نہیں ہے۔ کہا یہ سب کا ایک جیسا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ سب، اللہ کی مخلوق ہیں آپ بھی آجائیں۔ آپ بھی اللہ اللہ کریں شاید آپ کے کہنے پر اللہ آپ کے بیمار کو شفا دیدے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے کہا آج یہاں ٹھہرو اللہ اللہ کرو بیمار کو بھی سکھاؤ۔ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ہر آدمی اللہ اللہ کر سکتا ہے وہ کہتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ سب لوگ کیسے کر سکتے ہیں۔

اس طرح سے لوگوں کے ذہن میں بات بٹھا دی گئی ہے کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں ایک خاص کوالٹی کے ایک خاص کیٹیگری کے ایک، خاص کیلبر کے لوگ ہیں۔ باقی لوگ عام لوگ ہوتے ہیں وہ یہ نہیں کر سکتے۔ انہیں لوگوں کا حصہ ہے وہ ہی کر سکتے ہیں یہ بات۔

انبیاء کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ ہر وہ شخص جسے رب العالمین نے پیدا فرمایا ہے اور عقل و شعور بخشا ہے وہ مکلف ہے اپنے تعلقات کو رب العالمین ہی سے استوار کرنے کا اور اسے اتباع رب العالمین ہی کی کرنی ہے دوسرے کسی کی بات اللہ ہی کے لیے سنے گا۔ اور اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی کی بات سنے گا تو وہ اس کی عبادت کر رہا ہے جس کی بات سن رہا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کر رہا۔ اس بارے یہ جھگڑا ہوتا تھا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے، ورنہ کسی بھی نیک کسی بھی صالح کسی شریف آدمی سے جھگڑے نہیں ہوتے اور شرافت ہو یا نیکی ہو یا بھلائی ہو اس کا کمال جو ہے اس درجہ کمال ہوتا ہے نبی کی ذات۔ ہر نبی شریف ترین، نیک ترین اعلیٰ ترین اور بہترین انسان ہوتا ہے۔ تو پھر سب سے اچھے سب سے نیک سب سے پسندیدہ اور سب سے پیارے آدمی کیوں نیکی نہیں کرتے لوگ اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ لوگوں

المرشد
نہ ملنے کی شکایت

ماہ کے آخر میں صوبیدار عبدالغفور عابد دارالعرفان، سب، آفس لوہ پور ضلع چکوال کو بھیجیے۔ اپنا خریداری نمبر لکھنا مت بھولیے۔

میں اپنے آپ کو زبان سے تو اپنے انسان ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن درپردہ وہ اپنے آپ کو درجہ الوہیت پہ بٹھار کھا ہے نام خدا کا لیتے ہیں نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لیتے ہیں لیکن باتیں اپنی منواتے ہیں اللہ کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ اور عموماً وہ لوگ جو مقتدا یا پیشوا ہوتے ہیں ان میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔

تو فرمایا سب سے پہلے بڑے بڑے لوگوں نے کہا یہ تو آپ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اس طرح کیسے ہو سکتا ہے تو انہوں نے فرمایا لوگو! میں تو گمراہ نہیں ہوں میں پاگل نہیں ہوں۔ میں کوئی راستے سے بھٹک نہیں گیا۔

مجھے تو اُس پروردگارِ عالم نے رسالت سے سرفراز فرمایا۔ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اس کی ربوبیت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ انسانوں کی طرف نبوت اور اس کی فیوض و برکات ارسال فرماتا ہے۔ اس نے مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور میں نبی ہونے کے ناطے رسول ہونے کی وجہ سے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ جو کچھ میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔

میں تم تک، اپنے رب کی بات پہنچاتا ہوں جو تمہیں میں بتا رہا ہوں فرمایا یہ میرا مشورہ نہیں ہے میری رائے نہیں ہے میں تمہیں صلاح نہیں دے رہا۔ بلکہ میں تمہیں رب العالمین کا پیغام دے رہا ہوں، خدا کا حکم سنا رہا ہوں۔ تمہارے رب کا یہ حکم ہے کہ تم اس طرح سے کرو اور میں تمہارے لیے تمہارے نفع کی بات کرتا ہوں۔

اور تیسری بات یہ ہے وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ بحیثیت نبی کے میں وہ حقائق جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جن حقائق کی تم خبر نہیں رکھتے۔ نبی کے پاس وہ علوم و حقائق اور وہ باتیں ہوتی ہیں جن کو جاننے کے لیے امت محتاج ہوتی ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی۔ اور تعلیمات راستہ نہیں۔ تمام انبیاء کہتے ہیں اللہ کی ذات، کے بارے اللہ کی صفات کے بارے اللہ کی پسند و ناپسند کے بارے اخروی زندگی کے بارے روح کے بارے ثواب و عذاب کے بارے فرشتوں کے متعلق جنت و دوزخ کے متعلق یا جنت بھی آخروی زندگی کی حقیقت یا فلاسفی ہے یہ ساری باتیں جو ہیں یہ صرف اور صرف اللہ کا نبی یا اللہ کا رسول ہی بتا سکتا ہے انہی کے بتانے سے اُمتی یا ہم جان سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تو ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔

لیکن فرمایا یاد رکھو نبی اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہتا اس لیے نبی کی بات کو اس انداز سے نہ لو کہ عام انسان کا مشورہ ہے چھ مزید مشورہ حاصل کریں گے۔ بہتر ہے یا نہیں بلکہ جو کچھ نبی فرماتا ہے وہ اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس پہ مشورے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں تو سننے اور ماننے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری یہ یقینی بات ہوتی ہے کہ نبی جو بھی حکم دیتا ہے اس میں امت کے فائدے کی بات ہوتی ہے کبھی اس میں نقصان کی بات نہیں ہوتی۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ اگر ساری امت بھی مل کر مشورہ کرے تو اس بات کی حقیقت کو نہیں پا سکتی۔ چونکہ امت کے علوم ان باتوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جو باتیں نبی جانتے ہیں جو علوم انبیاء کو عطا کیے جاتے ہیں جو کچھ نورِ نبوت سے دیکھتے ہیں ساری امت بھی بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے تو جب تک ان حقائق تک ان کی رسائی ہی نہیں ان کی نگاہ ہی نہیں پہنچتی اُن کی سمجھ ہی نہیں پہنچتی تو اس کے بارے وہ مشورہ کیا کریں گے تو امتی کے لئے بہترین راستہ ہے کہ وہ اپنی ساری توانائی اس بات پہ صرف کر دے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کیا حکم دیا ہاں اس بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے کہ جو بات ہمیں پہنچائی جا رہی ہے۔ کیا یہ واقعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے یا محض آپ کے نام پہ کوئی دوسرا اپنی طرف سے کوئی بات کہہ رہا ہے۔ اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ لیکن جب یہ یقین ہو جائے جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ حکم ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو اس میں مزید مشورے کی گنجائش نہیں رہتی۔ تمام انسانیت کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بہتری کا یا فلاح کا یا نجات کا یا فائدے کا باقی نہ رہا کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اپنی ساری انرجی اپنی ساری قوت اس بات پہ صرف کر دے کہ جو حکم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم تک پہنچایا ہے ہم اپنی پوری طاقت سے اس پر عمل کرنے میں کوشش کریں۔

شکاریات

برفانی چوٹیوں کا ہیرو

حضرت مولانا محمد اکرم

شکار عمر بھر میری کمزوری رہا ہے اب عمر بھی ڈھل چکی ہے ساتھ مختلف امراض نے بھی دوستی کر لی ہے خصوصاً ذیابیطس جو سب کو جامع ہے اب عمر بھر کی ساتھی ہے۔ علاوہ ازیں موٹر کے دو حادثات نے بدن کا ڈھانچہ ہلا دیا ہے۔ اور ہر حرکت پہ کسی نہ کسی جوڑ سے چوں چوں کی آواز آتی ہے درد کی ٹیس اٹھتی ہے اس کے باوجود شکار کا جذبہ جوان ہے۔ ایک بار تبل آزاد کشمیر تک خوار ہوا ہوں اور شکار بھی نہ ملا۔ اب کے پھر سوجھی تو ہمالہ کی ترائی میں جانے کی تیاری کی اور مشہور مارخور جو اڑیال ہی کی نسل کا جانور ہے اور پہلے اس کے بارے لکھ بھی چکا ہوں کہ شکار کی تیاری کر لی۔

چنانچہ مارچ کے پہلے ہفتے رخت سفر باندھا اور چل نکلا، ڈاکٹر بٹر تو ویسے ساتھ ہوتے ہیں۔ بٹ صاحب ابوظہبی سے آئے تو انہیں بھی ہمالہ کے دامن میں جھانکنے کا شوق چرایا۔ اس طرح ہم تین آدمی عازم سفر ہوئے۔ دامن کوہ میں ایک دوست کو اطلاع دی۔ جن کا نام نامی ٹی ڈبلیو میر ہے۔ اور یوں ان کے پاس آ دھمکے۔ اس گاؤں میں حاجی صاحب معروف شکاری ہیں۔ پہلے سے کئی بار مل کر شکار پہ جا چکے تھے۔ انھیں بلوایا اور یوں تعداد پانچ ہو گئی۔ اب مسئلہ کھانے پینے کا تھا۔ چنانچہ ایک عزیز ارشاد السالکین کو یہ ذمہ داری سونپی اور یوں اللہ کے نام پہ ہم تیار تھے۔

فیصلہ ہوا کہ اعلیٰ الصبح ایک بجے روانہ ہوا جائے اس لیے کہ ایک، تو راستہ خطرناک ہے اور خراب بھی ہے، دوسرے کم از کم تین سو کلو میٹر فاصلہ طے کرنا ہے۔ چنانچہ رات سب نے اپنے اپنے حصے کی اشیاء کو پیک کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادویات، بٹ صاحب نے کیمرہ، میر صاحب نے بندوقیں اور چھوٹے جوان نے کھانے پینے کا سامان جمع کیا۔ جیپ تیار کی اور عشاء کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے۔

مگر مجھے نیند نہ آئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب میرے کمرے میں تھے۔ انہیں بھی سونے نہ دیا اور گپ شپ چلتی رہی۔ پونے ایک بجے سب کو جگایا۔ تہجد ادا کی چائے پی اور نکلتے نکلتے ڈیڑھ بج گیا۔ ڈرائیونگ کے لیے قرعہ فال میرے نام پڑا۔ یاد رہے بندوقیں ہمارے پاس صرف دو تھیں ۷.۶۲ اور ایک بارہ بور کہ ممکن ہے کوئی پرندہ شکار کر لیں۔

باتیں کرتے رہے اور جیپ پہاڑی راستوں کے پیچوں میں ہچکولے

کھاتی نجر کے وقت تقریباً دس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ایسی وادی میں داخل ہو چکی تھی۔ جہاں سے شکار گاہ شروع ہو جاتی ہے۔

سرد ترین ہوا سینہ شق کئے دیتی تھی۔ فجر کا وقت داخل ہو رہا تھا۔ جیپ روکی اور نماز ادا کی چائے کا ایک ایک کپ پیا اور جیپ میں بیٹھ کر ذکر الٰہی کرتے لگے۔ کچھ روشنی ہوئی تو آگے چلے۔

اب ہماری رفتار بہت آہستہ تھی۔ جیپ میں سے ہی پہاڑی کے دامن اور تنگ وادی کو دیکھتے جا رہے تھے کہ علی الصبح وہاں مارخور کے ملنے کے امکانات تھے۔ ورنہ پہاڑوں کے پیچھے تو کسی بھی وقت مل سکتے ہیں۔ مگر وہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہمارا اشکار تو یہ تھا کہ سڑک پہ فائر کریں۔

آہستہ آہستہ بلندی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وادی بھی دامن سمیٹتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وادی تنگ ہو رہی تھی سردی کے علاوہ ہوائیں شدت بھی آتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ سات بجے کے قریب ہم ایک ایسے موڑ پہ تھے جہاں ایک طرف سے دھوپ پڑ رہی تھی اور وادی میں یا دھوپ کے گزرنے کا راستہ تھا یا برفانی پانی کا نالہ سا بہہ رہا تھا۔ یہی مختلف نالے یوں جوں نیچے جاتے ہیں ملتے جاتے ہیں اور آخر دریا کا روپ دھار لیتے ہیں۔

میں تو بڑی احتیاط سے جیپ لے جا رہا تھا کہ نالے کے پار مٹی پہ کنکر گرے چند چھوٹے ٹکڑے اوپر سے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کنکر گر رہے ہیں یہ عموماً اوپر جانوروں کے ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے جیپ کے روکے بغیر حاجی صاحب سے کہا کہ پچھلا دروازہ کھول کر اوپر دیکھیں۔

حاجی صاحب نے خبر دی کہ مارخور اوپر جا رہے ہیں جیپ رک گئی، ہم نیچے اترے دیکھنا شروع کیا تو آٹھ دس کے قریب مادائیں اور نوخیز بچے ایک طرف سے گزر رہے تھے اور کافی بلندی پر جا چکے تھے۔ ویسے بھی مادہ یا چھوٹا ہمارا ٹارگٹ نہیں تھا۔ اور ان چٹانوں سے انہیں دیکھنا بھی آسان کام نہیں تھا کہ ان کا رنگ اور عمودی چٹانوں کا رنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ معاً ایک چٹان کی اوٹ سے تین بڑے بڑے نر نکلتے ہوئے نظر آئے۔ یہ جوں جوں بڑے ہوں رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ تقریباً نمایاں ہوتے ہیں۔ اگرچہ پانچ سو گز سے تو دور ہی ہوں گے مگر شکاری کب جانے دیتا ہے۔ فوراً رائفل سے نشانہ لینے لگا اب

رزقِ حلال

امام احنبلؒ کے صاحبزادے حضرت صالحؒ اصفہان کے قاضی تھے۔ ایک مرتبہ امام حنبلؒ کے خادم نے ان کے باورچی خانے سے خمیر لیکر روٹی تیار کی۔ جب روٹی امام صاحب کے سامنے لائی گئی تو آپ نے پوچھا یہ اسقدر گداز کیوں ہے۔ خادم نے حال بتایا تو آپ نے فرمایا جو شخص اصفہان کا قاضی رہا ہو اس کے ہاں سے خمیر کیوں لیا۔ یہ روٹی میرے کھانے کے لائق نہیں رہی یہ کسی فقیر کے سامنے پیش کر کے پوچھ لینا کہ اس روٹی میں خمیر تو صالح کا ہے اور آٹا احمد بن حنبل کا اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو لے لو۔ چالیس یوم تک کوئی سائل نہیں آیا اور جب روٹیوں میں بدبو پیدا ہو گئی تو خادم نے دریائے دجلہ میں پھینک دی۔ لیکن امام صاحب کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس دن سے دریائے دجلہ کی مچھلی نہیں کھائی۔

دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایسی جگہ ہو جہاں جانور زخمی ہو کر گرے تو آپ اسے حاصل بھی کر سکیں۔ ورنہ مارخور اکثر ایسی جگہ نظر آتا ہے جہاں انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ میں بھی سانس روک کے اندازہ کر رہا تھا کہ کہاں فائر کروں۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ چٹان بالکل عمودی تھی آخر ایک جگہ ایک جانور ایسی پوزیشن میں کھڑا ہوا کہ ایک ابھری ہوئی چٹان تھی جو اس عمودی چٹان پر کنگرے کی طرح سجی تھی۔ اور جانور اس کے اوپر نظر آیا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس طرف گرے تو نیچے آنے تک راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور اگر دوسری طرف گر گیا تو پھر شاید پرندوں کی غذا کا کام دے فاصلہ زیادہ تھا سوچا گر بھی گیا تو تڑپے گا۔ اٹھنے کی کوشش کرے گا اور یقیناً نیچے آئے گا۔ چنانچہ ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ گونجا اور ساتھ ہی جانور چٹان کی دوسری طرف گر گیا۔ ساتھی دوربین لگائے دیکھ رہے تھے اور گولی ایسی کاری لگی کہ پھر تڑپا بھی نہیں۔ باقیوں نے رفتار بڑھا دی۔ اوپر کو بھاگنے لگے۔ یہ رائفل بہت ظالم قسم کا زخم لگاتی ہے۔

میدان بنا ہوا تھا۔ جس کے کنارے پر ہم سفر کر رہے تھے اس طرف تو تھوڑی سی ڈھلان تھی مگر دوسری طرف ایسی پہاڑی تھی جو دریا سے ہی سیدھی اٹھتی تھی اور کوئی دو سو گز تک چٹان سی تھی۔ جس میں انسان کے لیے چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر اس پر تازہ برف بھی پڑی ہوئی تھی کہ اتنی بلندی پر تو کم از کم ہر رات کو ضرور برفباری ہوتی ہے۔

ہم حسنِ فطرت کی رعنائیاں دیکھنے میں مصروف تھے۔ سامنے سے ایک شیر نے سڑک عبور کی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے برفانی شیر کو شاہانہ انداز سے گزرتے دیکھا۔ سفید برف کی طرح جسم اور اس پر گول گول دائرے سے بنے ہوئے تھے نہایت لمبی دم۔ چمکدار آنکھوں اور بہت بڑے بڑے پنجوں والا SNOW LEOPARD، سنو لیپرڈ تھا۔ جو خونخوار ترین درندہ ہے۔ یہ انتہائی بلندیوں کا باسی ہے۔ اور برفانی درندوں میں تو سب سے بڑا ہے۔ سوائے یہ کہ مگر زندگی میں اس کا ریکارڈ ہے کہ کبھی دو بھی مل کر نہیں رہتے ہر ایک نے اپنا علاقہ مختص کر رکھا ہوتا ہے۔ جو دوسرے کو گھسنے نہیں دیتا۔ صرف ملنے کا موسم ہو تو نر مادہ کچھ روز مل کر رہتے ہیں۔ ورنہ پھر علیحدہ ہی رہیں گے۔ یہ کبھی شیر اور چیتے کی طرح کنبہ نہیں بناتا۔

شیر ہم سے بے نیاز دریا کے تختے پر سے گزرا اور سامنے کی ترچھی چٹان پر چڑھنے لگا مگر اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے لڑکے کھیلتے ہیں۔ اگلے پنجوں سے گولے سے بناتا ہوا نظر آتا تھا اور آہستہ آہستہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی روکی رائفل نکالی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا نہیں۔ بیٹھے ہوئے فائر کریں مگر میں تو سٹیرنگ کے پیچھے پھنسا ہوا تھا۔ لہٰذا نیچے اترنے کے سوا چارہ نہ تھا اور نیچے اترنا بہت خطرناک تھا کہ اگر درندہ حملہ آور ہو گیا تو کیا ہوگا۔ کیوں کہ اس کی عادت ہے کہ یا تو فائر کے دھماکے سے بھاگ جاتا اور یا پھر حملہ کر بیٹھتا ہے یہ دوسری صورت اس کے معمولی زخمی ہونے میں بھی بالکل یقینی تھی یعنی اگر گولی کم خطرناک لگتی تو ضرور حملہ کرتا۔ مگر اللہ کا کرنا یہ ہوا جب میں نیچے اترا تو درندہ رک کر کھڑا ہو گیا اور اپنا رخ تو اسی طرف رکھا مگر سر گھما کر مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آ رہی تھی۔

میں نے رائفل کندھے سے لگا کر نشانہ لیا اور انتظار کرنے لگا کہ ممکن ہے یہ پہلو بدلے اور یوں بڑا ٹارگٹ بن جائے۔ مگر وہ اسی طرح کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ حاجی صاحب جیپ میں سے شور کر رہے تھے کہ ابھی فائر نہ کریں اسے پہلو بدلنے دیں مگر اس میں خطرہ بھی تھا کہ یہ پہلو بدل کر کھڑا رہے گا یا حملہ آور ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو پھر اسے مارنا آسان کام نہیں ہوتا کہ وہ بجلی کی طرح حرکت کرتا ہوا آتا ہے۔ برف میں جہاں کئی کئی فٹ پاؤں دھنس جاتے ہیں یہ ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے اور باہر تو ۷۰ میل تک اس کی رفتار ہوتی ہے تیز یہ بہت بڑی چھلانگ لگاتا ہے لہٰذا میں نے ٹریگر دبا دیا کہ زیادہ انتظار کا موقع نہ تھا۔ رائفل گرجی اور شیر وہیں کھڑا رہا تو میں نے کہا کہ گولی اس کا کام کر گئی ورنہ اسے یا بھاگ جانا چاہیئے تھا یا پھر حملہ آور ہوتا۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے پہلو بدلا تو دوسرا فائر کیا وہ چند قدم اوپر کو چلا پھر ایک فائر کیا وہ دو قدم اور بڑھا۔ حاجی صاحب نے کہا مجھے دیں میں فائر کروں۔ انہوں نے کیا تو دو قدم اور چلا۔ میر صاحب نے للکارا مگر میں نے منع کر دیا۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف ایک میگزین تھی۔ جس میں ۲۸ گولیاں تھیں جن میں بیشتر درہ کی تھیں۔ جو یا تو فائر نہ ہوتیں اور اگر ہو جاتیں تو نشانہ پر لگنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ کوئی بھی نہ لگی اور چند مس بھی ہو گئیں یعنی سرے سے فائر ہی نہ ہوئیں اور اب باقی صرف تین تھیں۔ کچھ تو راستے میں فائر ہو چکی تھیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بیشتر پر فائر ہونے والی گولی صحیح تھی۔

خیر شیر کھڑے کھڑے بیٹھ گیا مگر ابھی تک سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر آرام سے سر رکھ دیا۔ تو میں جان گیا کہ اس نے جان دیدی معاً اس نے پلٹا کھایا کہ پنجوں کی گرفت ختم ہو چکی تھی اور پھر پلٹے پہ پلٹے کھانے لگا۔ حاجی صاحب چلا رہے تھے۔ خدایا اسے نیچے لانا خدایا راستے میں رک نہ جائے حتیٰ کہ وہ پلٹے کھاتا دریا کے منجمد پانی پر آ گرا۔

اب ہماری باری تھی۔ احتیاط کے ساتھ اس کی طرف اترنا شروع کیا۔ حاجی صاحب کو بندوق تھمائی کہ ممکن ہے معمولی جان بھی ہو تو آدمی کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی میں اترے تو برف میں گرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اور میرے سوا سب نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کی تقلید کی۔ دراصل جہاں برف کرسٹل

اگرچہ دور تھا مگر وہیں رہ گیا اور ہم حسرت سے ان بلند چٹانوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو ہماری ہنسی اڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہمالہ کی ترائی یہ زندگی اور موت کا کھیل روزمرہ کے معمولات کا حصہ ہے۔ بہرحال ہم نے سمجھا کہ پرندوں کی غذا کا اہتمام ہوا اور آگے چل دیئے۔ دراصل ہمیں اطلاع تھی کہ ۱۷۰۰۰ فٹ بلندی پر ایک وادی ہے آج کل اس میں مارخوروں کا ایک گلہ ملتا ہے جو دو صد سے زیادہ ہی ہوں گے۔ اور وہی وادی ہمارا ٹارگٹ تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے ابھی مزید دو گھنٹے جیپ چلانا تھی۔ لہٰذا ہم ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے چلتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ایک دم سے بلندی شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں رک کر چائے پی دراصل اس سے پہلے وادی کا سفر کافی تھکا دینے والا تھا۔ اگرچہ چڑھائی زیادہ نہ تھی مگر بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر ایک دم سے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور سڑک اوپر تلے بہت سے موڑ کھا کر بلندی کو چھو لیتی تھی۔ جہاں ہم تھے یہاں دریا جم چکا تھا اور ہر طرف برف کی چاندی بکھری پڑی تھی۔ چائے کا کپ پیا اور چل پڑے۔ اللہ کا نام لے کر اوپر اوپر چڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ موڑ ختم ہوئے اور سڑک کسی حد تک سیدھی نظر آئی۔ ساتھ دریا بھی اوپر آ چکا تھا۔ اور ایسی جگہ تھی جہاں سے دریا شروع ہوتا تھا۔ یہاں پانی جما ہوا تھا اور دریا پر خوبصورت بن چکی ہو وہاں پاؤں پڑ جائے تو گرنے کا مزا آ جاتا ہے اور اٹھ اٹھ کر گرنا پڑتا ہے۔

بہرحال یوں رفتاں و خیزاں ہم اس تک جا پہنچے۔ بڑی احتیاط سے دیکھا مر چکا تھا۔ اب مسئلہ کھال اتارنے کا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ناپ کیا تو ناک سے دم تک ساڑھے سات فٹ تھا (۲½ فٹ) اور برفانی شیر کا یہ بہت بڑا سائز تھا ورنہ تو سفید چیتے کی نسل وہاں ملتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کتے کے قد کا ہوتا ہے بہرحال ہم نے کھال چیتے ہیں رکھی اور گوشت تو مقامی آبادی کا حصہ تھا جو کبھی کبھار اگر شیر ہاتھ آ جائے تو اس کے گوشت پر باقاعدہ تہوار مناتے ہیں۔ شکاریوں کے نعرے اپنا الگ حسن رکھتے ہیں اب واپسی کا سفر درپیش تھا جو کم از کم، گھنٹے کا تھا لہٰذا ہم جانب منزل چلے اور شام ہوتے ہوتے قیام گاہ پہنچ چکے تھے۔ یہ زندگی کا انوکھا تجربہ تھا کہ چند سو گز سے زمین پر کھڑے ہو کر آمنے سامنے سے ایسے خونخوار درندے کا شکار ہوا۔ جس کے بارے ایسا سوچنا بھی مشکل ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بیماری اور حادثات کے بعد اللہ کریم نے اس قدر صحت بخشی کہ میں نے اس روز تقریباً ۱۴ گھنٹے پہاڑی راستوں پر جیپ چلائی جو بجائے خود ایک مشکل ترین کام تھا۔

رُشدی اور آج کا مُسلمان

ظفر احمد قریشی

رشدی ملعون ہے، نجس ہے۔ وہ جہنم واصل ہوا کہ ہوا، اس کا قصور ناقابل معافی۔ اس کی معافی بے وقعت۔ اس کا قصور یہ ہے کہ اس لعین نے کائنات کی مقدس ترین ہستیؐ اور ان سے وابستہ پاکیزہ ارواح کی شان میں خاکم بدہن بہت ہی گھٹیا زبان استعمال کی ہے۔ حضورؐ اُمت کے دلوں میں جو مقام رکھتے ہیں اور جو ان کی قدر و منزلت ہے کسی بھی کلمہ گو کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس مردود پر جس نے یہ جسارت کی ہے۔ لعنت نہ بھیجے اور اسے جہنم واصل کرنے کی سعی نہ کرے خوش نصیب ہوگا وہ مسلمان جس کے ہاتھوں یہ ملعون ذلت کی موت مرے گا۔ آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی جب یہ جسارت کی گئی ہے ہر مسلمان خون کے آنسو رو دیا ہے اور کیوں نہ روتا اس کے ایمان پر براہ راست زد جو پڑی۔ جو ہستیؐ اسے دنیا کی کسی بھی شے سے زیادہ عزیز بلکہ عزیز ترین ہے یعنی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے سامنے ماں باپ، بہن بھائی، اولاد، جائیداد حتیٰ کہ اپنی جان بھی بے معنی ہے۔ اُن کی شان میں خاکم بدہن بے ہودگی کا اظہار کیا گیا تو ہر کلمہ گو تڑپ کر رہ گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آج کا گیا گزرا مسلمان بھی اپنے نبیؐ پر جان قربان کرنے کو نہ صرف تیار ہے بلکہ اپنے لیے ایک عظیم سعادت سمجھتا ہے۔ الحمدللہ، یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔

پتہ چلا کہ مسلمانوں کو اپنے نبیؐ سے جنون کی حد تک عقیدت ہے۔ اگر آپؐ اسے ہر شے اور ہر مال و دولت سے عزیز تر نہ ہوں تو اس کے ایمان کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے پیارے نبیؐ کی شان اقدس میں کوئی بیہودگی کی بات کر سکے۔

صورت حال یہ ہو تو دیکھنا ہوگا کہ آج کل کا مسلمان، حضورؐ کے فرمودات سے روگردانی کیوں کر رہا ہے؟ اسے تو حضورؐ سے بے پناہ عشق ہے مگر وہ ہر اس کام کو کیے جا رہا ہے جس سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے۔ مسلمانوں نے حضورؐ کے اسوہ حسنہ کو چھوڑ رکھا ہے۔ سنتیں ترک کر رکھی ہیں۔ داڑھی رکھنے والوں کو تمسخر کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ رشوت لینے اور دینے والوں کو آگ جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ وہ لی بھی جا رہی ہے۔ اور دی بھی جا رہی ہے۔ سود لینے اور دینے والوں کو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ کہا گیا ہے۔ مگر وہ بغیر کسی جھجک کے لیا بھی جا رہا ہے دیا بھی جا رہا ہے

چوریاں ہو رہی ہیں۔ ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا مال کھایا جا رہا ہے۔ امیروں کے لیے علیحدہ قوانین ہیں، غریبوں کے لیے علیحدہ۔ انصاف نام کو نہیں۔ بے شمار مساجد میں بن چکی ہیں۔ ان میں دن میں پانچ مرتبہ حی الفلاح کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں کوئی فلاح لینے نہیں جاتا۔ اللہ کے گھر سے بلاوا آ رہا ہے، کوئی پرواہ نہیں کر رہا۔ جو چند غازی ہیں وہ بیچارے غریب، بوڑھے اور بیکس اشیاء میں ملاوٹ، کم تولنا، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، بات بات پر جھوٹ۔ بے حیائی اور فحاشی کا دور دورہ، اساتذہ کی توہین۔ دھوکا فریب، عورتوں میں آزاد ہو جانے کی خواہش، اسلامی قوانین اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود پر انہیں اعتراض، مزدور بغیر پسینہ بہائے پیسے بٹور رہے ہیں۔ اور اکثر رہے ہیں۔ کسی رشتہ کا کوئی تقدس نہیں۔ ایسی حرکات جن کی وجہ سے پچھلی قومیں مغضوب ہوئیں وہ بھی موجود، پیسے کی خاطر کوئی بھی گناہ کرتے پر رضامندی، فہرست اتنی طویل ہے کہ انہیں لکھنے کے لیے پورا دفتر چاہیئے۔

یہ سب لکھنے کا مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ اگر کوئی مردود اپنے انجام سے بے خبر ہو کر آپؐ کی شان میں، خاکم بدہن، گستاخی کا مرتکب ہو تو مسلمان جہنم واصل کئے بغیر چین سے نہ بیٹھیں اور اگر وہ خود پوری زندگی، حضورؐ کی نافرمانی میں گزار دیں۔ بڑی ڈھٹائی سے احکامات، کی صریحاً خلاف ورزیاں کریں۔

ان کی شکل و شباہت، رہنا سہنا، معاملات اگر کافروں جیسے ہی ہوں تو ایسے مسلمانوں کو کیا کہا جائے۔ فیصلہ کوئی مشکل نہیں۔ ہر وہ مسلمان جو آپؐ کا حکم نہیں مانتا وہ خاکم بدہن، گستاخ ہی متصور ہوگا اس کی سزا کیا ہونی چاہیئے۔ اس کا فیصلہ بھی ہونا چاہیئے۔

آج جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس کی تصویر کشی تو اوپر کی گئی ہے۔ مگر کیا اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو اتنی زیادہ ڈھیل دے رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ملک بخشا تو کسی اور مقصد کے لیے تھا مگر ہم چل کسی اور طرف ہی پڑے ہیں۔ نہ کوئی غم نہ کوئی تشویش۔ ہر شخص راتوں رات امیر بننے کے چکر میں ہیں۔ صرف نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں جیسا ہے اور بس، نماز کافر نہیں پڑھتا مسلمان نہیں پڑھتا۔ روزے کافروں کے لیے نہیں ہیں۔ مسلمانوں نے ویسے ہی چھوڑ رکھے ہیں۔ زکوٰۃ پر رقم اٹھتی ہے وہ بند کر دی ہے۔ شیطان نے ہر برے کام کو خوبصورت بنا کر دیکھ

> ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادیؒ کو آنکھوں کی تکلیف ہو گئی۔ ایک آتش پرست طبیب نے ہدایت دی آنکھوں پر پانی نہ لگنے پائے۔ آپ نے فرمایا۔ وضو کرنا تو میرے لیے ضروری ہے۔ طبیب چلا گیا آپ نے وضو کیا عشاء کی نماز ادا کی اور سو گئے۔ صبح اٹھے تو آنکھیں بالکل درست تھیں۔ تکلیف ختم ہو چکی تھی۔ جب طبیب نے آنکھوں کا معائنہ کیا تو حیرت سے پوچھا کہ رات بھر میں آپ کی آنکھیں کیسے ٹھیک ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا وضو کرنے سے۔ طبیب پر حقیقت ظاہر ہو گئی اور یہ کہہ کر مسلمان ہو گیا کہ درحقیقت مریض میں ہوں اور طبیب آپ ہیں۔ (حضرت جنید بغدادی)

رکھا ہے۔ اس کی پیروی کی جا رہی ہے۔ مالک و رازق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پیروی ابلیس کی ہو رہی ہے۔

علماء نے اپنے اپنے مذاہب بنا لئے ہیں۔ ایک کا ماننے والا دوسرے کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا۔ مذہب تو ایک تھا یعنی اسلام اسی مذہب کی تعلیم حضورؐ نے دی۔ اس پر خود عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے عمل کیا۔ صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین نے عمل کیا مگر آج کل اتنے مذاہب ہو گئے ہیں کہ گنتی مشکل ہے۔ مسلمانوں کو اس الجھن میں ڈالنے والے وہ حضرات ہیں جو خود کو عالم کہتے ہیں۔ للہ۔ وہ اپنے آپ کو ٹھیک کریں۔ اور ملت کو جو ایک تھی اسے ایک ہی رہنے دیں۔ آپس کے تفرقات اور اختلافات کو ختم کر کے پوری امت مسلمہ کو ایک کریں اور مسلمانوں میں جو بے راہروی آ گئی ہے اسے ختم کروائیں تاکہ ہمارے پیارے ہادیؐ کی خوشنودی حاصل ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا ملے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ یہ ڈھیل کبھی بھی ختم کی جا سکتی ہے۔ ہمیں نہیں دیتا کہ اس کی رحمتوں کا امتحان لیتے جائیں۔ ضرورت ہے کہ پہلے گناہوں اور لغزشوں پر سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ کے لیے پکے اور سچے مسلمان بن جائیں۔ یاد رہے کہ اگر ہم نے آج ہی سے صحیح راہ پر چلنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اسی راہ پر ہی چلائیں گے۔ ارادہ اور نیت ہماری ہوئی تو مدد اس کی ضرور ہو گی۔ انشاء اللہ۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے۔ آمین!

مومن

حضرت مولانا محمد اکرم

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو بات ختم ہاں یہ ٹھیک ہے جب ہم کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں تو دنیا میں انسانوں کے سامنے شرعی احکام میں معاشرتی آداب میں قانون میں ان تمام باتوں میں ہمیں وہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ کی بارگاہ میں اس کے ہاں ابدی اور دائمی زندگی میں یا جس عرصہ سے ہم مسلمان ہیں ہم اسلام کو قبول کرتے ہیں وہ کیسے پوری ہوتی ہے اس کے لیے رب جلیل نے اپنے بندوں کی کچھ معین علامات اور نشانیاں بتادی ہیں۔

قرآن حکیم وہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اپنے نزول سے لیکر قیامت تک ساری انسانیت کے لیے ہے۔ اس میں جتنی نشانیاں بیان کی جاتی ہیں بھلائی اور نیکی کی ان پر جو بشارتیں ہوتی ہیں جو بھی اُن کو اپنالے وہ اُن بشارتوں کا مستحق ہوتا ہے۔

اس میں جو باتیں گناہ کی یا نافرمانی کی بتائی جاتی ہیں جو ان کو اختیار کرنا ہے۔ ان جو عذاب اس میں بتایا گیا ہے وہ اس کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ قرآن کی یہ آیات تو یہود و نصاریٰ کے لیے ہیں۔ اور یہ صحابہ کے لیے ہیں یہ درست نہیں ہاں جب قرآن نازل ہو رہا تھا، تو جتنی خوبیاں جتنی نیکیاں جتنی بھلائیاں قرآن حکیم نے بیان فرمائی ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے مطابق مثالی مسلمان صحابہ کرام ہیں۔ جتنی برائیاں بیان فرمائی ہیں۔ اُن کے مطابق کافر مشرک یہود اور نصاریٰ اس وقت دنیا میں موجود تھے لیکن جب بھی کوئی ان کی مشابہت اختیار کرکے اس وعید کی زد میں آتا ہے یا صحابہ کی متابعت اختیار کرکے بشارت کو پالیتا ہے تو وہ اس کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ نزول آیت کے وقت تو اس کی مثال صحابہ کرام تھے لیکن قرآن اپنے نزول سے لے کر قیامت تک کی انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اس لیے ارشاد فرماتا ہے۔

جو لوگ ایماندار ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی بات ایمان کے بعد ہجرت ہے۔ اس عہد مقدس میں تو لوگوں نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر کفار کی ایذا کے مقابلے میں دین کو نہ چھوڑا دنیا کو گھر کو مال کو دولت کو رشتوں کو ناطوں کو چھوڑ کر قربانی کرکے جو نکل کھڑے ہوئے اسے ہجرت کہا گیا ہے۔ لیکن علماء کے مطابق حقیقی ہجرت یہ ہے کہ کوئی شخص قبول ایمان سے پہلے جن باتوں پہ جا رہا ہے جو اس کی عادتیں ہیں جو اس کی خصلتیں ہیں۔ جو اس کا مزاج ہے جو اس کے نزدیک نظریات ہیں۔ جب اللہ کے ساتھ ایمان لائے تو پھر اپنے لوحِ دل کو بالکل صاف کرلے۔ اس پہ پہلے اس نے جو کچھ لکھ رکھا ہے اس کو یکسر مٹا دے۔ اس پہ وہ لکھے جس کا حکم اللہ، اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیں۔ اسلام اس پر جو لکھنا چاہے دینوی ہجرت بھی بہت بڑا کام ہے۔ لیکن صحابہ نے یہ دونوں ہجرتیں کی تھیں پہلی ہجرت انہوں نے پہلے کی تھی اس لیے دوسری ہجرت انہیں کرنا پڑی۔

دل جو کچھ جدی پشتی یا رسومات یا رواجات کے مطابق

یا قوم اور معاشرے کے بین جو کچھ بھی تھا ان سب باتوں کو انہوں نے مٹا دیا اور اپنے دل میں اس بات کو بٹھا لیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی۔ اس پر جم گئے۔ اس پر سختی سے کہ اس کے لیے انہیں پھر گھر چھوڑنا پڑا۔ شہر چھوڑنا پڑا۔ مکان چھوڑنے پڑے یعنی جو ہجرت صورتی تھی وہ بعد میں وقوع پذیر ہوئی اور ہجرت معنوی پہلے۔ اب یہ ہجرت صوری جو ہے یا صورتاً جو ہجرت ہے اس کے تو خاص خاص مواقع ہوں گے۔ لیکن یہ معنوی ہجرت جو ہے یہ ہمیشہ کے لیے ہے جیسے کوئی ایمان میں داخل ہو تو سارے کا سارا کفر سے نکل کر سارے کا سارا اسلام میں آجائے اور یہ ہجرت کرلے۔

یہ ہجرت بہت بڑا کام ہے۔ لیکن اللہ کریم نے فرمایا ایمان ایک ایسا جذبہ تپاں ہے جو اسے صرف ہجرت پر نہیں رہنے دیتا اب ایک شخص نے گھر بار زمین جائیداد، مال، دوست، رشتہ دار ہر شے اللہ کے نام پر قربان کر دی بہت بڑا کام ہے۔ اب جہاں وہ پہنچا ہے وہاں خاموش ہو کر بیٹھ رہے اس سے تو جو کچھ ہو سکتا تھا کر لیا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہجرت کر کے جہاں پہنچے وہاں بھی اپنے عمل سے اپنے مال و دولت سے اپنی زبان سے اپنے کردار سے جس قابل ہو اور جس کا موقع پیدا ہو جس کی ضرورت ہو اس کے لیے اس سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا رہے جدوجہد کرتا رہے، کوشش کرتا رہے، نچلا ہو کر نہ بیٹھے ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھے۔ اس پہ قناعت نہ کرے کہ جی ہم نے تو ہجرت کر لی ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ فرمایا جس میں جذبہ ایمان ہوتا ہے وہ یہ کر ہی نہیں سکتا۔ ہجرت کرنا کون سا آسان ہے بہت مشکل کام ہے وہی کرتا ہے جس کے دل میں نور ایمان ہو اور نور ایمان وہ شعلہ فروزاں کرتا ہے جو اسے خاموش نہیں بیٹھنے دیتا۔

اور جن لوگوں نے واقعی اللہ کے لیے ہجرت کر لی اور ہجرت کے بعد اللہ کی راہ میں کوشش کرتے رہے اور اپنے کردار سے اپنے مال سے اپنی جان سے اپنی تمام قوتوں سے۔

۱۔ فرمایا اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑے مرتبے کے لوگ ہیں۔ مدینہ منورہ میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے ایک صحابی کا گزر ہوا۔ فقیر تھے بظاہر مال و دولت نہیں تھا لباس بھی قیمتی نہیں تھا۔ بال بھی پریشان تھے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پوچھ لیا اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، عرض کی یا رسول اللہ بیچارا خانہ بدوش آدمی ہے غریب ہے مفلس ہے اسے تو کوئی رشتہ بھی دینے کو تیار نہ ہو وہ ایسا قلاش اور مفلس آدمی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں لوگوں کے نزدیک تو ایسا ہی ہے لیکن اللہ کے نزدیک یہ سینکڑوں امیروں پر بھاری ہے دنیا والوں کی نگاہ میں تو ایسا ہی ہے لیکن اس نے یہ ساری مصیبت اپنے سر اللہ کے لیے لی ہے اور اللہ کا، اللہ کے دین کا کام کرتا ہی رہتا ہے۔ اللہ کے نزدیک تو یہ سینکڑوں امراء پر بھاری ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے۔ اگر یہ اللہ کے بھروسے پہ کوئی بات کہدے تو اللہ وہ ضرور پوری کریگا یعنی اگر یہ گزرتے ہوئے اللہ پہ اعتماد کرتے ہوئے کوئی بات کہدے کہ ایسا ہی ہوگا تو اللہ کریم ایسا ہی کر دیں گے۔ اس کی اتنی عزت ہے اللہ کے ہاں۔

تو اللہ فرماتے ہیں بظاہر اگر ہجرت کرتے میں تکلیف آجائے بظاہر اگر اللہ کا دین بیان کرنے میں تکلیف آجائے بظاہر ممکن ہے آدمی مفلس ہو جائے بظاہر ممکن ہے اس کے وسائل ادھر خرچ ہو جائیں، دولت خرچ ہو جائے یا کسی سخت مزاج حکومت سے یا کسی سخت مزاج افسر سے یا کسی سخت مزاج مذہبی لیڈر سے یا کسی سخت مزاج انسان سے پالا پڑے اس کیلئے باعث تکلیف بھی ہو لیکن حقیقتاً اللہ کے نزدیک ایسے لوگ بڑے معزز ہیں۔ بہت بڑا رتبہ رکھتے ہیں اللہ کے نزدیک اور فرمایا تم سب دیکھو گے۔ ساری دنیا دیکھے گی اللہ ان کی بہت بڑی عزت افزائی کریں گے میدان حشر میں بھی آخرت میں بھی دائمی زندگی میں بھی بلکہ جو بظاہر نیک لوگ جو اپنے عقائد کی اصلاح کر لیتے ہیں، اعمال کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ اللہ کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کے دین کے لیے، انہیں ایک طرح کی جنت دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے۔ جو دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ اس میں بستے ہیں۔

۔ اللہ کی طرف سے انہیں مسلسل خوشخبری پہنچتی رہتی ہے۔ اللہ کی طرف سے ان پہ یہ بات مسلسل وارد ہوتی رہتی ہے کہ گھبراؤ نہیں اگر تم مسلسل مشکل چوٹی کی طرف چڑھ رہے ہو، تو اس چوٹی پہ بہترین اور حسین باغ ہے۔ تجلیات باری ہیں۔ رضائے باری ہے اگر راستہ مشکل ہے، راستہ پیچیدہ ہے

تو گھبرانے کی بات نہیں۔ جب یہ راستہ ختم ہو گا تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمہاری دستگیری کے لیے موجود ہے۔ اس کی رضامندی تمہارے ساتھ ہے اور اس کی جنتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ جن کی نعمتیں نہ ختم ہوتی ہیں اور نہ ان میں زوال آتا ہے اور نہ کبھی تمہیں ان سے کوئی نکالے گا۔

اگر کسی کو بیس سال پچیس سال تیس سال پچاس سال سو سال ایک ایسے راستے پہ چلنا پڑے جو سارا مشکل بھی ہو تو وہ جس منزل پہ پہنچتا ہے ایسی کوئی دوسری منزل کائنات میں نہیں ہے۔ جہاں جاؤ فنا گھات میں ہے۔ جہاں جاؤ ایذا گھات میں ہے، دکھ اور پریشانیاں ہیں۔ تکلیفیں ہیں۔ لیکن فرمایا۔ اللہ نہیں اپنی رحمت کی بشارت دیتے رہتے ہیں کہ اگر بحیثیت انسان تم سے کوئی کمزوری ہو گئی تو میری رحمت اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ اگر غلطی ہو گئی اسے معاف کرنے کے لیے میری رحمت موجود ہے تم کوشش کرتے رہو۔ میری رضامندی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میری جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے جس میں بے حساب نعمتیں ہیں اور جو تمہارا گھر ہے تمہاری قیام گاہ ہے، تمہارا ٹھکانہ ہے اور پھر تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔

لیکن صرف

جنت، صرف رضامندی، صرف رحمت نہیں اس سے بڑھ کر کہ بھی اللہ کے پاس بہت بڑے اجر ہیں۔ رحمت بھی نچھاور کر دی اپنی رضامندی کی خبر بھی دے دی۔ جنت بھی عطا کر دی۔ پھر اس سے بڑھ کر کیا ہو گا۔ حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے یہی سوال نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کسی نے پیش کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اصل نعمت تو اللہ جل شانہٗ کا دیدار ہے۔ جسے دیدار باری کا ایک لمحہ نصیب ہو جائے وہ ایک جنت نہیں، کروڑوں جنتیں اس لمحے پہ قربان کر سکتا ہے وہ اربوں راحتیں اس ایک لمحے پہ لٹا سکتا ہے جنتیوں کو جنت میں بے شمار نعمتوں، بے حساب راحتوں، بے حساب شفقتوں کے باوجود اللہ کی ذات کا دیدار بھی نصیب ہو گا کے گا۔ رب جلیل فرماتے ہیں کہ میرے پاس تو بہت بڑے بڑے انعامات ہیں۔ جس کو اللہ کریم کی ذات کا دیدار ہو گا۔ اگرچہ جنتی سارے حسین ہوں گے۔ خوبصورت ہوں گے۔ جنت میں جانے والا چہرہ چاند سے زیادہ روشن ہو گا۔ ہر داخل ہونے والے انسان کی عمر اس طرح سے ہو گی پوری داڑھی اتری ہوئی بھی نہ ہو اور مسیں بھیگ رہی ہوں، قد ایک جیسے ہوں گے اعضاء متناسب ہوں گے حسین ترین وجود ہوں گے۔ اور چہرے سے، اعضاء وجوارح سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں گی۔ شمع کی روشنیوں سے زیادہ روشنی ہو گی۔ اس کے باوجود جب بھی جس کو اللہ کے دیدار سے نوازا جائے گا تو حضورؐ فرماتے ہیں کہ وہ پلٹ کر جب گھر آئے گا تو ایک مرتبہ گھر میں اسے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ اس کے چہرے کی نورانیت اور حسن میں ایک جھلک سے اتنا اضافہ ہو جایا کریگا

یہ ساری بات بتا کر رب جلیل نے فرمایا۔ اگر تم ایمان کے داعی ہو تو تمہیں یہ منازل حاصل کرنا چاہئیں۔ یہ ایمان والوں کے لیے ہیں۔ دعویٰ ایمان کر کے بیٹھ رہنا اور دنیا کی عارضی لذتوں میں فانی لذتوں میں اور فضول لایعنی میں پھنس جانا مال حرام کے لیے طمع کرنا، فضول جھوٹ بولنا، وقت کو ضائع کرنا گناہ میں ملوث ہو جانا۔

فرمایا، اگر تمہارا کوئی دوست، کوئی ساتھی، کوئی واقف کوئی رشتہ دار حتیٰ کہ تمہارا بھائی یا تمہارا باپ اللہ کی اطاعت پر نافرمانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی دوستی چھوڑ دو۔

اصل بات یہ ہے کہ رب کریم کو سانجھے لوگ پسند نہیں ہیں جہاں کسی انسان نے اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے امید اور تمنا جوڑ لی اللہ کریم اسے اپنے دروازے سے اٹھا دیگا بڑی سادہ سی بات ہے۔ مفت میں لوگ مشرک شرک کے فتوے لگاتے رہتے ہیں۔ کفر کے فتوے دیتے رہتے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی پر فتویٰ لگانے کی میرے اور آپ کے فتوے سے کیا ہو گا۔ جسے اللہ نے اپنی بارگاہ سے اٹھا دیا۔ میں اور آپ اس پر ایمانداری کا لیبل لگاتے رہیں تو کس کام کا۔ اگر اللہ کا کوئی مقبول بندہ ہو تو اسے ہم مشرک مشرک کہتے رہیں تو اس کا کیا بگڑے گا۔ لہٰذا ہر آدمی کو اپنی فکر کرنی چاہیئے کہ یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ اتنا نازک کہ میں نے بڑے بڑے موحدین کو دیکھا ہے، زبان سے توحید کا اقرار کرتے ہیں۔ اہل اللہ پر طنز کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بھی سخت کلامی کر جاتے ہیں۔ مگر دنیا کا ایک معمولی سا کام آتا ہے۔ ان کی

نمازیں قضا ہو ہو جاتی ہیں اور کافروں کے در پہ پڑے رہتے ہیں۔

مجھے ایک مرید اپنے پیر صاحب کا قصہ بتا رہے تھے۔ انہوں نے وعظ کیا ہم وہاں موجود تھے اور انہوں نے یہ مسئلہ ارشاد فرمایا۔ کہ شیعہ کو اسلام علیکم کہنا شرعاً جائز نہیں اور ان کا یہ مسلک درست تھا۔ کیونکہ اسلام علیکم صرف مسلمان کے لیے مسلمان کا تحفہ ہے اور شیعہ چونکہ اسلام سے خارج ہیں اس لیے انہیں اسلام علیکم نہ کہا جائے یا اگر وہ کہہ دیں اسلام علیکم تو وعلیکم السلام نہ کہا جائے بلکہ اور کوئی جواب دیدیا جائے۔ مثلاً آپ اچھے ہیں خیریت سے ہیں۔ اس طرح سے بات کر دی جائے۔ غلطی سے کسی کے منہ سے نکل جائے یہ اور بات ہے کسی بھی کافر کے لیے ہندو ہو سکھ ہو یا عیسائی یہودی کوئی بھی ہو، مرزائی ہو انہیں سلامتی کی دعا دینا یہ جائز نہیں ہے۔ یہ مومن کا مومن کے لیے تحفہ ہے۔ اس پہ انہوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر فرمائی اس کے بعد جمعہ پڑھایا پھر فرمایا ہم ان کے کمرے میں بیٹھے تھے تو کسی کا ٹیلیفون آیا تو انہوں نے تین دفعہ کہا وعلیکم السلام وعلیکم السلام وعلیکم السلام تو وہ خود مرید مجھے بتا رہا تھا کہ میں نے پوچھ لیا کہ حضرت کون ہیں تو کہنے لگے کہ فلاں شاہ صاحب تھے۔ ایوب کے زمانے میں قومی اسمبلی کا ممبر ہوا کرتا تھا اور بیٹا رافضی تھا کٹر معنوں میں۔ تو کہنے لگا میں نے کہا حضرت آپ نے ابھی تو گھنٹہ ڈیڑھ محنت کی کہ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ کہنے لگے بھئی کچھ دنیا میں بھی تو گزارہ کرنا ہے

اس طرح کی توحید میں نے محض مثال کے طور پہ پیش کی۔ میں نے نام نہیں لیا نہ پیر کا نہ مرید کا۔ ان کا مرید میرا دوست ہے۔ کسی کا نام لینے سے غرض بھی نہیں ہے۔ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہیں یہ بات ہم میں بھی تو موجود نہیں۔ یعنی توحید کا رشتہ اتنا نازک ہے۔ اللہ فرماتے ہیں جو میری نافرمانی کرتے ہیں۔ اگر تم میرے اطاعت شعار ہو تو تمہاری اس کی کیا دوستی۔ یعنی کسی کے پاس تبلیغ کے لیے جانا کسی کو نصیحت کرنا، کسی کو وعظ کرنا یہ اور بات ہے۔ معاملات دنیا کاروبار کرنا، مال خریدنا، کسی کو بیچنا یہ اور بات ہے اور دل سے کسی کے ساتھ تعلق اور دوستی رکھنا یہ اور بات ہے تو ہر اس آدمی کے ساتھ جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا ولی دوستی شرعاً حرام ہے۔ اور کافر کے ساتھ اتنی شدت سے حرام ہے کہیں آپ کی دوستی مرتد اسے کفر پر جمے رہنے میں اسکے ساتھ تعاون نہ کرے اور اس کا سبب نہ بن جائے۔

اللہ نے بڑی کھری بات کی، اللہ کو زیب ہی کھری باتیں دیتی ہیں اُسے کسی سے کیا لینا ہے۔ اسے تو دینا ہی دینا ہے وہ بھی لگی لپٹی کہے تو سچ کون کہے گا۔ فرمایا تقاضائے ایمان یہ ہے کہ ایمان والو۔ اگر باپ ہو بھائی ہو وہ کفر سے محبت کرتا ہو اور ایمان سے نفرت کرتا ہو تو تمہیں اس سے دوستی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ چھوڑ دے اُسے۔

ایسا آدمی

سخت ظالم ہے میری دوستی کا دم بھرتا ہے۔ میرا بندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور کفار کو میرے محبت کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے پھر فرمایا۔

اے حبیب یا رسول اللہ کھلے لفظوں میں یہ بات فرما دیجئے۔

اگر تمہارے والدین، تمہاری اولادیں، تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں، تمہاری برادریاں، دیکھو کس شدت سے تفصیل گنی رب کریم نے تمہارے باپ، تمہارے بیٹے تمہارے بھائی۔ تمہاری بیویاں تمہاری برادریاں اور دولت جو تم نے جمع کر رکھی ہے اور کاروبار جس میں

تم نقصان سے ڈرتے ہو۔ کافر ناراض ہو گئے تو ہمارا کاروبار کس طرح چلے گا۔ بڑی کوٹھیاں جو تم نے بنائی ہیں اگرچہ یہ چیزیں اللہ سے محبوب ہیں۔

اللہ کے حبیب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے یہ چیزیں تمہیں روکتی ہیں۔ تو پھر انتظار کرو موت کا اللہ کے روبرو پیشی کا، میدان حشر کا پھر دیکھنا اللہ کا فیصلہ کیا ہوگا اب تم رہو ان رشتہ داروں کے ساتھ جو اللہ کے نافرمان ہیں۔ اس اولاد کے ساتھ جو اللہ کے نافرمان ہیں ان دوستوں کے ساتھ جو اللہ کے نافرمان ہیں اُن کوٹھیوں میں جن سے نکل کر تم اللہ کی راہ میں نہیں جا سکتے۔ اس دولت پر بیٹھو جو تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہے۔ اس کاروبار پہ بیٹھو جس پہ اللہ کی راہ میں تم سمجھتے ہو کہ نکلیں گے تو نقصان ہوگا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو اللہ کے بھی فیصلے ہیں۔

اللہ ایسے بدکاروں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ یہ یاد رکھو۔

اسلام میں نہ دنیا کمانا منع ہے نہ کوٹھی بنانا منع ہے۔ نہ شادی کرنا منع ہے نہ دوستی کرنا منع ہے۔ نہ برادری پالنا منع ہے نہ اولاد ہونا منع ہے نہ بیویاں ہونا منع ہے لیکن یہ سب چیزیں اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہوں یہ نہ ہو کہ صرف یہ چیزیں رہ جائیں اور اللہ کا دین چلا جائے۔ اللہ کے دین کو اللہ کے قرب کو اللہ سے جو تعلق ہے اس کو ان پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب چیزیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

محبت دو طرح کی ہوتی ہے ایک عقلی اور ایک اضطراری اضطراری محبت ہوتی ہے باپ کو بیٹے سے، اسے کوئی سکھاتا نہیں کہ اس سے محبت کرو۔ فطرتاً طبعاً مال جو ہم کماتے ہیں اس سے اضطراری محبت ہوتی ہے مشکل سے کمایا ہے اسے ہم ضائع نہیں کرتے، گھر جو بناتے ہیں اس سے محبت ہوتی ہے یہ محبت اضطراری ہوتی ہے۔ ایک ہوتی ہے محبت عقلی میں انسان تجزیہ کرتا ہے اچھے اور برے کا اور جس طرف اسے بھلائی اور خوبی نظر آتی ہے ادھر تعلقات بناتا ہے جدھر خرابی ہوتی ہے ادھر سے چھوڑ دیتا ہے یہ تجزیہ کیا جاتا ہے یہ جو عقلی محبت ہے تمام محبتوں پر اللہ کی محبت غالب ہونی چاہیئے۔ اضطراری محبت کا آدمی مکلف نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ سے انسان کی رشتہ داری تو نہیں کہ بھائی جیسی یا باپ جیسی یا بیٹے جیسی محبت پیدا ہو جائے یہ ایک اضطراری کیفیت ہے اور یہ وقتی اور لمحاتی ہے جو شعور و آگہی اس کے اندر ہے اگر اس کا دل زندہ ہو جائے۔ اس میں نور ایمان آ جائے وہ خود فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ بن کر رہنا ہے۔

اللہ کا بندہ بن کر رہنے میں حلال ذرائع سے زیادہ دولت کما سکتا ہے تو کمائے۔ جائز کاموں پر خرچ کرے۔ اچھا مکان بنا سکتا ہے بنائے۔ اچھا لباس پہنے، شادی کرے بچوں کو پالے۔ پڑھائے ان کی خدمت کرے پھر یہ سارے کام ثواب بن جاتے ہیں جب یہ اللہ کی راہ میں کئے جاتے ہیں۔ لیکن جو ہماری زندگی کا طریقہ ہے کہ اللہ کو اللہ کے ساتھ تعلقات کو اپنے کردار کو سب کو بھول کر صرف ایسی دنیا میں لگ جائے تو اللہ فرماتے ہیں یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ یعنی تم نے عقلاً بھی یہ تجزیہ کرنا چھوڑ دیا کہ یہ سب کچھ اگر ہم کرتے بھی رہیں تو فرمایا انتظار کرو ایک وقت آ رہا ہے۔ جب تمہارے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔

یعنی وہ بات جو ہمیشہ رہنے والی، اللہ کا جو تعلق ہے انہوں نے خود چھوڑ دی جو تم اپنا رہے ہو یہ تم سے موت چھڑا دے گی۔ پھر کیا کرو گے اور فرمایا اس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے بدکاروں کو اللہ ہدایت نصیب نہیں فرماتا۔

سویہ ہے حلیہ قد و قامت رنگ و روپ اس کا جس کو اللہ کریم مومن سمجھتے اور جانتے ہیں۔ اب ہم ہیں ہمارا دعویٰ ایمان ہے اللہ اسے قبول فرمائے لیکن ہمارے سامنے قرآن حکیم کی ان آیات کا شیشہ بھی ہے۔ آئینہ بھی ہے اور جب تک اس دنیا میں کوئی سانس لے رہا ہے اس کے پاس فرصت بھی ہے۔ آئینہ اس لیئے ہوتا ہے اسے دیکھ کر آدمی کوئی داغ دھبہ کوئی خرابی چہرے پہ ہے تو اسے دور کر لے ان خرابیوں ان باتوں میں سے اگر کوئی ہے تو ابھی وقت ہے اللہ سے عہد کریں۔ اللہ سے ہم توبہ کریں اپنی اصلاح کے لیے محنت کریں اپنی اصلاح کے لیے دعا کریں۔ خدایا ہم تو عاجز ہیں تیرے ہی در پہ پھر حاضر ہیں۔

ہم تو اصلاح کے قابل بھی نہیں رہے تو ہی ہماری اصلاح بھی فرما اتنا بھی کرتے رہیں تو وہ ہمیں محروم نہیں کرے گا۔ اس کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ اللہ کا ذکر ضروری ہے۔ نماز پنجگانہ ضروری ہے۔ آدمی کم از کم حلال حرام میں تمیز ضرور کرے۔

کہ حرام کھا کر تو دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ اس کی ایسی مصیبت ہے کہ حرام جس پیٹ میں چلا جائے اس کی بات نہیں سنی جاتی۔ اسکی خواہش و آرزو کی کوئی قیمت اور پرواہ نہیں ہوتی اور جو دوسروں کے لیے برائی سوچتے ہیں اسے خود بھی بھلائی نصیب نہیں ہوتی، انسانیت کے لیے عموماً اور مسلمان اور مومن کیلئے خصوصاً نیک تمنا پیدا کرنا چاہیئے نیک خواہش، نیک آرزو کرنی چاہیئے اور جس قدر ہو سکے نیکی کے کاموں میں پوری قوت صرف کرنی چاہیئے کہ شاید کب زندگی ساتھ چھوڑ دے۔ اور اللہ کا تعلق ہمیں قائم رکھنا چاہیئے۔

اللہ کریم ہم پہ مہربانی فرمائیں۔ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیں اور اپنی رحمت سے نوازیں۔

ذرا آہستہ

قاریہ

عجیب بات ہے گھر بھر میں سب سے چھوٹا بچہ جوان ہو کر بھی بچہ ہی رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر بڑا ہو کر بھی بڑا نہیں ہو پاتا۔ نہ صرف یہ کہ گھر والے اس کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے رہتے ہیں (خواہ اس کی گود میں اس کا اپنا بچہ آن بیٹھے) بلکہ اس کے اپنے مزاج میں بھی حماقتیں، شرارتیں اور پھر کھسیاہٹیں اس عمر میں بھی قائم رہتی ہیں جب وہ خود بچوں کو شرارتوں پر ٹوکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

یہی حال ہمارا ہے۔ جی ہاں ہمارا شمار بھی خدا جانے خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے گھر کے چھوٹوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا گریجویشن کر لینے کے باوجود شرارتیں، حماقتیں، من مانی کرنے بلکہ اپنی منوانے کی عادات نہیں گئیں۔ سب سے بڑی اور بری عادت (میرے خیال میں) جو ہم چھوٹوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔ وہ ہے "میں" اور "میرا"۔ آنکھ کھولتے ہی گھر بھر کو اپنی طرف متوجہ پا کر ہم چھوٹے "کچھ بگڑ" سے جاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ کہیں بھی جائیں وہاں تمام محفل کے نور نظر بنکر رہیں اور ایسے میں اگر کانٹا بھی پاؤں میں چبھ جائے تو بس ہر شخص ہمارے لیے متفکر و پریشان ہوتے ہوئے ہمارے پیر کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہوئے خوب دلاسے دے۔

ہم جب اپنی اس جماعت میں آئے تو حضرت جی کا (جیسا کہ ان کی فطرت میں شامل ہے) بھرپور توجہ سے نوازنا تھا کہ ہم پھول گئے۔ (محاورتاً) اور سمجھ بیٹھے کہ یہاں بھی ٹھنکنا اور مچلنا ہمارا پیدائشی حق ٹھہرا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ادھر خط لکھتے اور ادھر جواب آجاتا اور ہم سمجھتے کہ حضرت جی ہمارے خط کے منتظر رہتے ہیں کہ کب آئے اور جواب دیں دیر تو بہت بعد میں کھلا کہ وہاں ڈاک کا جواب فوراً اس لیے دیدیا جاتا ہے کہ اگر دو دن کی ڈاک بھی اکٹھی ہو جائے تو ایک انبار لگ جاتا ہے) بہرحال ہم یہ سمجھے کہ بس یہاں بھی ہم ہی ہم ہیں۔ کریلے تو تھے ہی مزید نیم پہ حضرت جی کے پرخلوص انداز تخاطب نے چڑھا دیا۔ اور دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیلؔ وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

ایسے میں کبھی کبھار ڈاکٹر عظمت صاحب نے آداب شیخ سمجھانے کی کوشش کی تو ہم سمجھ بیٹھے ہم پہ حضرت جی کی خصوصی نظر عنایت دیکھکر حسد کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا دل ہی دل میں ڈاکٹر صاحب کو ہم نے اپنا پکا پکا حریف سمجھ لیا۔ اور یہ سب سمجھنے میں ہم خود کو حق بجانب

سمجھتے اس لیے کہ ہماری تمام تر بدتمیزیاں حضرت متبسم لب برداشت کر رہے تھے اور ادھر ہم ان اللہ والوں کے طریقۂ واردات سے یکسر نا آشنا دن میں ایک مرتبہ "سوں سوں" کرنے کے بعد حضرت جی کو اپنی جاگیر سمجھ بیٹھے۔

ایسے میں سالانہ اجتماع آگیا ہم بوجہ مجبوری نہ جا سکے۔ حضرت مدظلہ نے خط میں اجتماع پہ آنے کا لکھا تو رہی سہی کسر پوری ہو گئی اور سمجھ لیا کہ دار العرفان کا ذرہ ذرہ ہمارے لیے دیدہ دل فرش راہ کیے ہوئے ہے۔ پورا سال اسی زعم میں گزر گیا۔

اگلے سال لاہور سے چاچا جی تشریف لائے اور معلوم ہوا کہ صرف ہمیں اجتماع پہ لے جانے کے لیے لاہور سے گوجرانوالہ تک کا سفر کیا گیا ہے۔ پھر کیا تھا؟ ہم پھولے نہ سمارہے تھے۔ دار العرفان پہنچے تو مغرب ہو چکی تھی۔ ذکر کرنے کے بعد حضرت جی کو سلام کیا اور کوئی دوسری بات کرنے ہی کو تھے کہ ساتھی خاتون نے کہا "اب حضرت کا کمرہ خالی کر دیا جائے" سخت غصہ آیا کہ موصوفہ کیا جانے ہم کیا ہیں؟ بہر حال سوچا ایسے دلیسوں کو منہ کیا لگانا اور خاموشی میں مصلحت سمجھتے ہوئے باہر آگئے۔ اگلے دن تہجد کے ذکر کے بعد حضرت جی باہر تشریف لے گئے۔ بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اور پھر سن لیا حضرت جی بنڈی جا چکے ہیں۔ دل پہ گھونسا سا پڑا کہ پتہ بھی تھا ہم آئے ہیں اور کس قدر مشکل سے آئے ہیں پھر بھی ..... بغیر مغرب تک حضرت صاحب تشریف لے آئے مگر دن بھر کے سفر کے بعد یہی بہت تھا کہ ذکر کرانے دار العرفان تک تشریف لے آئے۔ تیسرے دن کی صبح جمعہ تھا۔ تہجد کے ذکر میں حضرت جی بوجوہ شریک نہ ہو سکے۔ اور صبح ۶.۳۰ ہی پہ چاچا کی طرف سے حکم ملا واپسی کے لیے رخت سفر باندھیے۔ یہ سنتے ہی دل مسوس کر رہ گئے مگر کیا کر سکتے تھے۔ بیگ کندھے پہ رکھا، چادر سر پہ لی اور نگہت سے کہا "حضرت جی سے سلام کہہ دینا" کہتے کہتے آواز لپکپا سی گئی مگر کسی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا ہماری فطرت میں کہاں شامل ہے۔ جھٹ چادر سے منہ ڈھانپا اور گاڑی میں جا بیٹھے۔ دل نے بڑی حسرت سے سوچا۔

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل ان کی
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو دم سے اپنے

اس کے بعد کئی مرتبہ حضرت جی سے ملنے کا اتفاق ہوتا

ایک انسان رات بھر اگر اللہ اللہ کرتا رہے اور چند لمحے نااہلوں کی صحبت میں گزارے تو بنانِ تعمیر کی نسبت تخریب آسان ہوتی ہے۔ رات بھر میں جو اس نے تعمیر کی ہے اسے ان کی ایک بات ضائع کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ یاد رکھیں نااہلوں کی صحبت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے جو ان میں جائے تو ان کو بھی اپنا جیسا کر لے۔ بعض لوگ جو ہیں وہ بدکاروں کے پاس بھی بیٹھ جائیں تو خود برائی میں ملوث نہیں ہوتے۔ انہیں نیکی کی طرف مائل کر لیتے ہیں یا کم از کم یہ اثر ہوتا ہے کہ جتنی دیر وہ ان کے پاس رہیں وہ کوئی برائی نہیں کرتے اگر پوری طرح نیکی کی طرف وہ پلٹ نہ آئیں تو جتنی دیر وہ شخص ان کے پاس رہے گا وہ برائی سے باز رہے گا۔ یہ بھی تو فائدہ ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص ایسی صحبت میں جا کر مغلوب ہو جائے اور ان کا حال اس پر غالب ہو جائے تو اس کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے

یہ دونوں باتیں ایک بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر غذا میں فرق آئے تو عبادت میں فوراً بے ذوقی آجاتی ہے اور اگر نااہل کی صحبت میں جانے سے اس کے حال سے مغلوب ہو گیا تو سارا اثر جا کر عبادات پر پڑتا ہے اور پھر اس کا ذکر میں جی نہیں لگتا اس طرف توجہ نہیں ہوتی اس طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

(مولانا محمد اکرم مدظلہ)

رہا اور ہم پہ جلد ہی یہ راز کھل گیا کہ حضرت جی کی خصوصی توجہ صرف ہم پہ ہی نہیں بلکہ ان کی نظرِ عنایت ہر ایک پہ یکساں ہے اور ان کا دل ہر فرد سلسلہ کے لیے خلوص و محبت سے معمور ہے۔ یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی

یہ دل بہت اداس ہے جب سے خبر ہوئی
ملتے ہیں اسی خلوص سے وہ ہر اجنبی کے ساتھ

انہیں احساسات کو لیے ہم ذکر کرتے رہے۔ المرشد پڑھتے رہے۔ حضرت جی سے ملتے رہے۔ اور آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے خیالات میں تبدیلی سی آنے لگی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب جو آداب شیخ سمجھانے پہ ہمارے جلال کا خاص نشانہ تھے قابل احترام نظر آنے لگے اور یہاں میں ان کے لیے اظہار ممنونیت ضرور کروں گی کہ ان کی وقتاً فوقتاً آمد (ویسے ان کی اس آمد کے لیے ہم کرنل صاحب کے بیحد مشکور ہیں) اور تبلیغ نے مجھ پہ خاطر خواہ اثر ڈالا اور یوں ہم "چھوٹے کچھ بڑے" ہونے لگے اور اس "بڑا" ہونے پہ پہلی بات جو مجھ پر منکشف ہوئی وہ حضرت جی مدظلہ کے مقام و مرتبہ کا ادراک تھا۔ تب مجھے پتا چلا کہ استاد شاگردوں سے کتنا ہی بے تکلفی اور خلوص سے مخاطب کیوں نہ ہو وہ استاد ہی رہتا ہے۔ اور اس کی بے تکلفی میں بھی ایک نمایاں حد قائم رہتی ہے۔ وہ کلاس میں شاگردوں کو کتنے ہی لطیفے کیوں نہ سنائے شاگرد اس کے لطائف پہ مسکرا تو سکتا ہے مگر اس کی کرسی کے ہتھے پر نہیں چڑھ سکتا۔ اس لیے کہ لطیفے سنانے سے اس کا مقصد شاگردوں کی سطح پہ اترنا نہیں ہوتا بلکہ محض تفریح ہی تفریح میں شاگرد کی اصلاح کرنا ہے یا پھر اس نے روایتی استاد کا ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ کر مسکراتے ہوئے نہایت محبت سے شاگردوں کو اپنا علم بانٹنے کا سوچ رکھا ہے۔ ہم سب کی یہ بہت بڑی خوش بختی ہے کہ ہمیں مشفق و محبت کرنے والے استاد سے نوازا گیا ہے جو ہماری ہر بدتمیزی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے محبت بھری مسکراہٹ لیے اپنا خزانہ لٹائے جا رہا ہے۔ تو پھر کیا خیال ہے اس کی محبتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا مناسب ہے؟ تو پھر ہم بھی ان کی محبت کا جواب محبت سے دیں۔

سیدھی سی بات ہے حضرت جی سے محبت کے دعویدار تو ہم سب لوگ ہیں پھر کیوں نہ محبت کے تقاضوں پہ ایک نظر ڈال لی جائے۔ محبت کا پہلا تقاضا کیا ہے؟ تو اس کا جواب اقبال صاحب دے گئے ہیں۔ ؎

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"

آپ نے کبھی ایک بات پہ غور کیا کہ ذرا انسان میں جتنی زیادہ محبت ہوگی وہ اسی شدت سے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے جسقدر محبت دل میں گھر کرے گی اسی قدر بندگی اور عاجزی قلب میں جگہ بناتی جائے گی۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق برابری کا نہیں ہے وہ قادر مطلق ہے ہم مخلوق بے بس

اسی طرح استاد یا شیخ کی محبت بھی چونکہ ہم مرتبہ سے محبت نہیں ہوتی لہٰذا یہاں بھی جس قدر بیباکی ہوگا اتنی ہی فرمانبرداری آتی جائے گی۔ استاد سے محبت کا دعویٰ بھی ہو اور پھر اس کا پڑھایا ہوا اسبق بھی یاد نہ کیا جائے؟ حضرت جی مدظلہ کی تعلیمات پہ عمل ان کی محبت کا دوسرا بڑا تقاضا ہے۔ ادب کو پہلے اور تعلیمات پہ عمل کو دوسرے نمبر پر کیوں رکھا گیا ہے۔ کہنا مانا ہی اس کا جاتا ہے جس کے لیے احترام و محبت دل میں ہو اور یوں بھی جس فرمانبرداری میں احترام و عقیدت نہ ہوگی وہ فرمانبرداری کس حد تک معتبر سمجھی جا سکتی ہے؟ اس کا اندازہ ہر ذی شعور لگا سکتا ہے۔

ادب کیا کیسے جائے؟ حضرت جی مدظلہ روایتی پیر نہیں ہیں؟ تو پھر ہم روایتی مرید بنتے ہوئے فقط ہاتھوں کے بوسے کو احترام شیخ کیوں سمجھنے بیٹھ جائیں۔ ایک مرتبہ حضرت جی مدظلہ سے یہی سوال پوچھا تھا کہ اب واحترام کیونکر کیا جائے؟ تو بڑا خوبصورت جواب ملا۔ "سب سے بڑا احترام و ادب یہی ہے کہ کسی بھی قابل احترام سمجھی جانیوالی ہستی کی تکلیف و رضا پہ نظر رہے۔ یعنی یہ دیکھ لیا جائے کہ شیخ کی خوشنودی کس بات میں ہے یا اسے ہماری کون سی بات یا عمل تکلیف دیتا ہے"۔

مجھے بوجوہ حضرت جی مدظلہ کے گھر چند یوم گزارنے کا شرف حاصل ہے۔ تب ان کی زندگی کا ایک نیا پہلو میرے سامنے تھا۔ تمام وقت مجھے گھر کے فرد کی طرح نہایت محبت و شفقت ملتی رہی بلکہ حضرت جی کی اہلیہ محترمہ نے نہ صرف ہفتہ بھر ہمیں اپنے ہاتھ کے بیحد لذیذ کھانے کھلائے بلکہ آتے وقت پیشانی پہ بوسہ اور ہاتھ میں ایک عدد سوٹ پیس تھما دیا (لینے کی بجائے یہاں تو دیا جا رہا ہے) لیکن اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ہم لوگ اس بات کو قطعی طور پہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ حضرت ایک باپ بھی ہیں۔ ان کی اپنی ایک نجی زندگی بھی ہے۔ دوران اجتماع یا عام دنوں میں

تعزیت

محب پور ضلع خوشاب کے دیرینہ ساتھی نور محمد صاحب کا لڑکا مسمی ظفر محمود قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے احباب دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

آپ مدظلہ نے پورا وقت ہم لوگوں کے لیے بلا امتیاز وقف کر رکھا ہے اگر ان چوبیس گھنٹوں میں وہ چند گھنٹے اپنے گھر پہ گزارنے کے لیے مخصوص کر دیں تو ہم لوگ وہاں بھی جا سلام کرتے ہیں۔ کیا یہ زیادتی نہیں ہے؟ ہم میں سے اگر کوئی دفتر میں چند گھنٹے گزارتا ہے تو تصور کیجئے اگر دفتر سے تھکے ہارے واپس آنیوالے کو گھر پہ بھی کوئی فائل لا تھمائی جائے تو اس کا کیا حال ہو گا؟

یوں بھی ہر چھوٹی بڑی پریشانی شیخ کو بتانے کے لیے بے چین رہنا خاصی بچگانہ سی حرکت نہیں؟ کوئی اہم معاملہ ہو تو ڈسکس کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر بچے کے زکام، بیوی کی بدمزاجی، خاوند کی تندخوئی، رشتہ داروں کی بدسلوکی، افسر کی گرم مزاجی، ماتحت کی شستی اور ساس نندوں کا رونا رونے کے لیے شیخ کی ذات کو چننا نہ صرف شیخ کے وقت کو ضائع کرنا ہے بلکہ اپنے آپ کے ساتھ بھی ناانصافی ہے وہ یوں کہ ڈاکٹر کے پاس جاکر آکو مرض کے بجائے دکھ کا تذکرہ لے بیٹھنا ڈاکٹر کے یا خود اپنے ساتھ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں مجھے اپنی جماعت کے ایک ساتھی کا شعر یاد آیا۔

چھوڑ اب اپنی کہانی نہ سنا، بور نہ کر،
دیکھ یہ وقت ترے شیخ کے آرام کا ہے

یہ درست ہے کہ

چھوڑ بے سود تفکر کو اویس اپنے لیے
صورت شیخ مداوا غم ایام کا ہے

مگر خیال یہ ہے کہ ہماری پریشانیوں اور دکھوں کی داستان اسقدر طویل نہ ہونے پائے کہ شیخ کے لیے باعث تکلیف بن جائے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب سے پوچھا فروری کے اجتماع پہ دارالعرفان جا رہے ہیں آپ؟ جواب ملا "نہیں۔ دارالعرفان میں حضرت کے پاس بیٹھنے کا موقع تو ملتا نہیں جانے کا فائدہ!" خیال رہے کہ یہ بات وہ صاحب کہہ رہے تھے جنہوں نے مہینوں کبھی ذکر کرنے کی زحمت نہیں کی۔ پھر یہاں یہ خیال آتا ہے کہ آخر ہم لوگوں نے شیخ کو سمجھ رکھا ہے؟

حضرت مدظلہ ہمارے روحانی معالج ہیں وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کس مریض کو کتنا وقت دینا مناسب ہے یا کسے الگ سے وقت دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہٰذا یہاں اپنے طور توقع لگا کر بیٹھنا یا انہیں بلاوجہ ڈسٹرب کرنا بالکل ایسے ہی ہے گویا بیمار ڈاکٹر کو مشورہ دینے بیٹھ جائے یا ڈاکٹر کی دی ہوئی خوراک میں رد و بدل کرنا چاہے۔

اگر ہم ایک نظر حضرت جی مدظلہ کی مصروفیات پہ نظر ڈالیں تو دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ سالانہ پروگرام دیکھیں تو سمجھ میں نہیں آتا یہاں حضرت جی کے اپنے آرام کے لیے وقت کہاں رکھا ہے؟ ہماری جماعت ماشاءاللہ جس تیزی سے پھیل چکی اور پھیل رہی ہے ہم سب جانتے ہیں۔ ایک عالم سے آنے والے ڈھیروں خطوط کا جواب دینا۔ اندرون ملک و بیرون ملک کے دورے۔ خطابات، اجتماعات۔ تفسیر القرآن کی تکمیل کے لیے انتھک محنت اور پھر اپنی ایک گھریلو اور کاروباری زندگی۔ ایسے میں حضرت کے گھر جا کر انہیں ڈسٹرب کرنا یا دارالعرفان میں حضرت کے کام میں بلاوجہ مخل ہونا ہماری خودغرضی نہیں؟ ہے نا؟ محبت سچی اور کھری محبت تو خودغرضی سے مطلق پاک ہوتی ہے تو پھر آیئے دیکھیں کہیں ہم نے محبت کے مفہوم کو تو غلط نہیں سمجھا؟ اپنی اغراض کو محبت کا نام تو نہیں دیدیا؟

یہ درست ہے کہ شیخ کے ساتھ ایک وقت کا ذکر مہینوں کے تنہا کئے جانے والے ذکر سے بہت بہتر ہے اور اس کے لیے وقتاً فوقتاً ہونے والے اجتماعات ہیں اس ابر رحمت سے پوری طرح فیضیاب ہونے میں مدد دیتے ہیں اور پھر ؎

زاہد کمال پیر مغاں تجھ سے کیا کہوں
مرشد وہاں خطاب ہے ادنیٰ مرید کا

اتنی بڑی نعمت حاصل کرنے کے بعد یا یہ گراں قدر نعمت حاصل کر سکنے کے باوجود اگر ہم اپنی نہایت چھوٹی چھوٹی سی خواہشات کے ہاتھوں کہیں۔ کہیں بھی معمولی سی غلطی، گستاخی یا بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہوئے اپنے گزشتہ اعمال ضائع کروا بیٹھیں اور ہمیں خود اس کی خبر بھی نہ ہو تو کیا یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہو گا؟ اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو گی؟ جی ہاں شیخ اور مرید کا رشتہ جس قدر گہرا، قریبی اور سچا ہوتا ہے اسی قدر نازک اور حساس بھی ہے اور اپنی ناسمجھی میں ہم یہی بات بھلا بیٹھے ہیں۔

محبت تجھے آداب محبت خود سکھائے گی
ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر

رمضان المبارک

فاطمہ صادق

رمضان المبارک ہمارے رب کی طرف سے رحمتیں برکتیں لیے پھر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ اس ماہ مبارک میں خیر و بھلائی حاصل کرنے کے اس قدر مواقع سمیٹے ہوئے ہیں کہ اگر ہر لمحہ سوچ کی درستگی نیت میں اخلاص اور حسن عمل کی سعی و جہد کی جائے تو ہم اتنا سمیٹ سکتے ہیں جتنا سال بھر کی انتھک کوششوں پر مشقت عبادتوں اور صبر و ضبط کے ساتھ حسن معاملہ کر کے حاصل نہیں کر پاتے کہ اس ماہ میں فرائض کا ستر گنا اور نوافل کا فرائض کے برابر اجر و ثواب ملتا ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں کی عبادات سے بہتر ہوتی ہے۔ جسے اللہ نے آخری طاق راتوں میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ تاکہ اس کو چاہنے والے اس رات کے شوق میں رکوع و سجود کریں۔ تسبیح و عبادت میں رات گزاریں اس کے حضور گڑگڑاتے ہوئے دعائیں کریں اور پھر وہ ان عبادات کو شرف قبولیت بخشے۔ اور آخری رات میں اپنے فرشتوں کے سامنے اپنے عبد کی مغفرت اور بخشش کا اعلان کر دے۔ اور بندہ اپنی مزدوری پا کر انعام بھی حاصل کرے۔ عید کی صورت میں ملنے والا انعام کہ — جس کی صبح فرشتے گلیوں کے کنارے پر کھڑے نماز عید کے لیے اٹھنے والے قدموں کو دیکھا کرتے ہیں۔

یہ مبارک ماہ جن لوگوں کے سروں پہ سایہ کرے گا کل اس سایہ میں اور بھی لوگ تھے جو آج ان لوگوں کے درمیان نہیں ہیں۔ لہذا ہمارے لیے یہ چند یوم بڑے قیمتی اور انمول ہیں کہ وقت کی تیز دھار معلوم نہیں اگلے سال ہمیں کہاں لے جائے۔

اس لیے اس کے ہر لمحہ سے فائدہ حاصل کریں۔ اپنی دعاؤں میں۔ اپنی ذات کے لیے، اپنے ملک کی، سلامتی، خوشحالی اور اسلامی نظام حیات کے مکمل نفاذ کی دعائیں کیجیے۔ رب کی رحمت حاصل کرنے کے لیے اپنی خطاؤں اپنے گناہوں سے استغفار کیجیے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد کیجیے اور آپ جہاں جس قدر کسی کی مدد کر سکتے ہیں، وہاں سخاوت سے کام لیجیے۔ وہ فیاض حقیقی ہمیں اپنی رحمت عطا فرمائے اور اس مبارک ماہ میں جو چند دنوں تک اپنی رحمتیں برکتیں لے کر آنے والا ہے ہمیں بھرپور استفادہ کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ ہمیں اس ماہ میں اپنے ایک سال کی زندگی کا محاسبہ بھی کرنا ہے کہ ہم نے اس ماہ کے علاوہ باقی مہینوں میں سال میں اپنے رب کریم کے ساتھ رشتہ تعلق کتنا رکھا اور ان نیکیوں میں اضافے کے لیے اور قبولیت کے لیے دعائیں مزید خدا سے کرنا ہیں۔ اور جو گناہ ہم سے سرزد ہوتے ہیں ان کی مغفرت خدا سے مانگنی ہے۔ کیونکہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ جس نے اس ماہ میں روزہ رکھا اور احتساب کے ساتھ اللہ نے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیئے (حدیث نبوی)

ہم اس مبارک ماہ میں جس قدر بھی ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ اللہ سے اپنا رشتہ تعلق مضبوط کریں تاکہ رمضان المبارک کے بعد ہم اپنے دلوں کو ایسا پائیں کہ ہمارے دلوں میں اپنے رب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی محبت اتنی نہ ہو جتنی کہ ان دونوں ہستیوں سے۔ ہمارا قلبی تعلق بھی صرف اور صرف خدا اور خدا کے رسول سے ہو۔

روح کا کینسر

حضرت مولانا محمد اکرم

اسلام نے انسان کو روح اور جسم دونوں کا مجموعہ قرار دیا ہے اور ان دونوں کے مختلف مدارج اور حالات قرآن و حدیث میں بار بار فرمائے گئے ہیں جن کے مطابق روح کی اصل عالم امر ہے اور تمام ارواح کو ایک وقت پیدا فرمایا گیا جیسا کہ عہد الست کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ سب سے ربوبیت باری کا عہد بھی لیا گیا یہ ایک حالت تھی پھر اپنی اپنی باری اور مقررہ وقت پر سب دنیا میں آئے اور آتے رہیں گے جب تک سارا کاروان گذر نہیں جاتا لیکن یہاں آنے کے لیے اور یہاں پر اپنا رول ادا کرنے کے لیے اسے بدن کی ضرورت تھی لہذا پہلے شکم مادر میں بدن تیار ہونا شروع ہوا جب مکمل ہوا تو روح اس میں داخل کر دی گئی یہ زندگی کا دوسرا دور تھا پھر دنیا میں ولادت ہوئی اور زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا اس میں بدن کو روح کی قوت اور سبب سے حیات نصیب ہوئی۔ اس میں مختلف حسیں بیدار ہوئیں اور اپنی ضروریات کا احساس ہوا ان کی تکمیل کے لیے تگ و دو شروع ہوئی اور یہی امتحان ٹھہرا کہ بظاہر مکلف بدن تھا اور روح اس کے تابع ہو گئی اب جس طرح حیات بدن کے لیے سورج نے مرکزی کردار ادا کیا، روشنی، حرارت، بارش، موسم، رات اور دن وغیرہ اس کے سبب وجود پذیر ہوئے ایسے ہی روح کی قوت صحت اور حیات کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے اور روحانی قوت و ادراکات کا سبب بنے روحانی قوت کا منبع عالم امر اور عالم بالا سے تعلق، صاف ستھری زندگی ایمان پر موت، عبادت الٰہی سے روشن راتیں اور اطاعت سے مزین دن ہیں جن میں بدن کی ضروریات کی تکمیل کے لیے وہ راستے اختیار کیے گئے جو اللہ کی طرف سے معین فرمائے گئے تھے لیکن بدقسمتی سے اگر کوئی روحانی قوت سے محروم رہا تو نفسانی تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی خواہشوں کو رہنما بنایا اور اللہ کی بارگاہ سے دور ہوا اور محض جسم کی حیات سے زندہ رہا جب وقت پورا ہوا تو روح کا وہ تعلق توڑ دیا گیا جس کے باعث جسم کو حیات دنیا حاصل تھی اور یوں چوتھے دور میں زندگی پہنچی اسے عالم برزخ کہا گیا ہے۔ یہاں سب پہنچنے والے پیچھے آنے والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس تبدیلی سے ایک اثر یہ بھی ہوا کہ روح براہ راست یا بالذات مکلف ٹھہری اور بدن اس کے تابع ہو گیا جب دنیا کا رنج و الم بدن کو ہوتا اور روح اس کے باعث متاثر ہوتی تھی یہاں کا عذاب و ثواب روح کو ہوا مگر ہر ذرہ بدن اس سے متاثر ہوتا ہے خواہ کسی حال میں ہو مٹی بن جائے یا راکھ نیز روح کے تعلق کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ کافر سے مومن کا بہتر، نیک اور صالح کا اس سے بہتر شہید کا اتنا مضبوط کہ بدن گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے اور انبیاء کا تعلق بالکل ویسا ہی رہتا ہے، جیسا دنیا میں تھا صرف یہ تبدیلی ہوتی ہے کہ اسباب دنیا کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی حالت کو حیات انبیاء کہا جاتا ہے اور جب یہ سارا قافلہ دار دنیا سے گزر چکے گا تو دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی آخرت قائم ہو گی اور حقیقی زندگی کی ابتدا ہو گی یہاں روح کا تعلق بدن سے اس قدر پختہ ہو جائے گا کہ بدن کو بھی روحانی حالت نصیب ہو جائے گی۔ یعنی جو حقائق صرف روح کے دائرہ ادراک میں تھے، انہیں بدن بھی اپنے محسوسات کے ساتھ محسوس کرنے

لگ گا جنت و دوزخ کو دیکھے گا، فرشتوں کو دیکھے گا ان سے باتیں کرے گا۔ اعمال کو متشکل دیکھ سکے گا۔ گویا یہ پانچویں اور آخری منزل ہو گی اور جنت یا دوزخ کی صورت میں ایک راستہ پہ ہمیشہ کے لئے چلنا ہو گا۔ مگر دیکھنے کے باوجود وہاں راستہ چننے کا اختیار نہیں ہو گا بلکہ اس راستہ پر چلنا پڑے گا جو دنیا میں اپنایا تھا، جہاں صرف روحانی ادراکات سے راستہ دیکھا اور اختیار کیا جا سکتا تھا۔

ان آیات مبارکہ میں زندگی کی اس آخری اور حقیقی منزل کا واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ایسا ہو گا اور وہ اس طرح ہے کہ جنت کے باسی گپ شپ کیلئے جمع ہوں گے، واقفیت و آشنائی تو ہو گی مل کر دنیا کے قصے یاد کریں گے اور باتوں باتوں میں کوئی ایک کہہ اٹھے گا کہ یار میرا ایک پڑوسی ہوا کرتا تھا وہ بہت ہی برا تھا خود بھی آخرت کا منکر تھا اور مجھے بھی کہتا تھا کہ تم کس پاگل پن میں پڑے ہو حیرت ہے ایسی ناشدنی باتوں پہ یقین کئے بیٹھے ہو بھلا جب ہم مر جائیں گے اور گوشت پوست گل سڑ کر خاک ہو جائے گا، ہڈیوں کے ریزے بکھر جائیں گے تو پھر کیا زندہ ہو کر کوئی نیا معاشرہ قائم ہو گا۔ یعنی ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں

پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ روح کے اپنے حواس و ادراکات ہیں اور بدن کے اپنے اگر روح کو نور ایمان نصیب ہو تو برکات نبوت سے اس کے ادراکات کو جلا ملتی ہے اور اس کی نگاہ آخرت عالم بالا اور برزخ سب تک پہنچتی ہے اور یوں اسے عین الیقین نصیب ہوتا ہے پھر بدن کے حواس روح کی نظر کے تابع ہو کر اطاعت الہٰی میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ ایک درجہ اس سے کم ہے یعنی علم الیقین کہ اسے اس قدر برکات نصیب نہ ہوں مگر اتنا کچھ ضرور مل جائے کہ ان باتوں پر یقین قائم رہے اور اطاعت کیلئے کوشاں رہے، مگر یہ کمزور درجہ ہے اس کے مقابلے میں بدن کے حواس کو دنیا کا حق الیقین حاصل ہوتا ہے لہٰذا یہ علم الیقین اس کے مقابلے کمزور پڑنے لگتا ہے اور یوں آدمی آخرت کا یقین رکھنے کے باوجود گناہوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے، یہ مرض کینسر کی طرح روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اگر بفضل اللہ کوئی معالج نصیب ہو جائے جو دنیا میں ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں کہ ارشاد ہے کہ وقلیلٌ مِن عبادی الشکور (میرے شکر گزار بندے بہت کم ہوتے ہیں) تو امید ہے کہ شفا ہو ورنہ روح کی موت واقع ہو جاتی ہے روح کی موت ان حقائق سے بیگانہ ہونا اور ان کا انکار ہے پھر ہر طرح برائی میں ملوث ہو کر جسمانی آنکھ سے دیکھتا ہے اور دیندار وں کو بے وقوف

کہنا شروع کر دیتا ہے جس طرح برہنگی تو ہر مذہب کے مطابق بے حیائی اور برائی سمجھی جاتی تھی مگر اب تہذیب مغرب میں برہنہ پھرنے والے خود کو دانا اور لباس پہننے والوں کو بے وقوف کہتے ہیں، بدن کی موت یہ ہے کہ روح کا تعلق جس کے طفیل یہ مصروف عمل تھا اور جس کے باعث قائم تھا، ختم ہوا لہٰذا یہ بے حس و حرکت بھی ہو گیا اور بکھرنے بھی لگ گیا مگر معدوم نہیں ہو جاتا، مادے ہی کی کوئی اور شکل اختیار کرتا ہے جس کے ساتھ روح کا رابطہ بہر حال رہتا ہے اگر روح مر جائے تو عظمت باری اور قدرت باری تو نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے تو اپنی حالت پر قیاس کر کے کہتا ہے کہ ان ذروں سے دوبارہ انسان کو بنا کر زندہ کرنا ممکن نہیں، حالانکہ جس عمل سے گزر کر پہلے پہلے زندہ ہوا تھا وہ اس سے مشکل تھا کہ اللہ کریم نے روئے زمین پر ذرات خاکی کو اجسام کی تعمیر کے لئے معین فرما دیا ہے، جب کسی کی باری آتی ہے تو پہلے اس کے وجود کے ذرات باپ کے صلب میں جمع فرماتا ہے جو مختلف اغذیہ اور ادویہ کی صورت میں وہاں تک پہنچتے ہیں ہوتی تو سب مٹی ہے مگر غلہ چاول گنا، مصالحے، دودھ گھی وغیرہ کی صورت میں انسانی وجود میں پہنچتی ہے اور ایک جسم کے اندر ایک معدے میں مل کر تقسیم ہو جاتی ہے، باپ کے حصے کے ذرات گوشت پوست بنتے ہیں مگر آنے والی نسل کے صلب میں مادے کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں وہاں سے شکم مادر میں منتقل ہوتا ہے تو یہی عمل ماں کے ساتھ جاری رہتا ہے کھاتی وہ ہے مگر اجزا کے دو حصے بنتے چلے جاتے ہیں اور بچے کے حصے کے ذرات سے اس کا بدن نمو پاتا ہے یہ اتفاقاً نہیں ہوتا اللہ کرتا ہے فرمایا ھو الذی یصورکم فی الارحام یعنی وہی ذات تمہیں رحم میں صورت عطا کرتی ہے اور پھر دنیا میں آ کر روئے زمین سے اپنے حصے کے ذرات سمیٹتا رہتا ہے جب پورے کر چکتا ہوتا ہے تو دنیا سے چلا جاتا ہے ارشاد ہے کہ ہر نفس اپنا رزق پورا کر کے مرتا ہے جس نے اس قدر پیچیدہ نظام تعمیر بدن کا ترتیب دیا اور اسے باقاعدگی سے چلا رہا ہے بھلا دوبارہ پیدا کرنا اس کیلئے کیا مشکل ہے اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ

کہ وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار پیدا کیا تھا مگر جب روح کینسر کا شکار ہو کر مر جائے تو ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا، اگر شروع ہی میں برکات نبوت نصیب ہوں تو عین الیقین ہوتا ہے یعنی وہ ان حقائق

مدیر المرشد کے نام

تبصرے، تجاویز۔ مشورے، مضامین برائے اشاعت اور دیگر معلومات کے لیے اس پتے پر لکھیے۔

اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو جوابی لفافے پر اپنا پتہ لکھ کر ساتھ بھیجیے۔

مدیر: ماہنامہ "المرشد"

15-A2 گلبرگ 3 لاہور - 54660

کو روح اور قلب کی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے جن کو کافر پس مرگ دیکھے گا اور ان پر یقین کر کے عمل کے لیے راہ متعین کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو برکات تقسیم فرمائیں ان کے طفیل تو صحابہ نے ذات باری کو روح اور دل کی آنکھ سے روبرو دیکھا فرشتہ یا برزخ اس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے، جبھی تو دنیا بھر کا کفر مل کر ان سے اقرار توحید کو نہ چھین سکا اور اسی منزل کا پتہ حدیث احسان سے ملتا ہے کہ اللہ کی عبادت یوں کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم ایمان یہ تو ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب دنیا کی زندگی ختم ہونے کو آتی ہے آخرت بھی نظر آنے لگتی ہے اور فرشتوں سے کلام بھی نصیب ہو جاتا ہے مگر وقت گذر چکا ہوتا ہے نیک بندوں کو تو فرشتے بشارت دیتے ہیں بدکاروں اور کافروں سے بھی باتیں کرتے ہیں اور قرآن میں ارشاد ہے کہ انہیں کہتے ہیں کہ

تم کیا کرتے رہے ہو عمر خرافات کی نذر کر دی تو وہ بات سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ ہم تو کمزور لوگ تھے، معاشرے کے دھارے میں بہتے تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ زمین وسیع نہ تھی، نقل مکانی کر لی ہوتی اگر گھر یا جائداد کی وجہ سے بدکاروں کو چھوڑ کر نیک لوگوں میں نہیں گئے تو آج دکان دولت سب چھوٹ رہا ہے اور آخرت کی رسوائی الگ یہی کچھ اللہ کے لیے چھوڑ کر نیک لوگوں میں جا بستے تو آخرت کر پا لیتے لیکن کافر کے لیے توبہ کا وقت گذر چکا ہوتا ہے ورنہ تو فرعون بھی مان گیا تھا اور چیخ اٹھا تھا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں، یہ جنہیں کمزور اور غریب ہونے کا طعنہ دے کر کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا، انہیں کے واسطے سے رب کے اقرار پر راضی ہو گیا مگر ارشاد ہوا

اب مانتے ہو اور جب ماننا چاہیئے تھا کافر رہے

لہٰذا رد کر دیا گیا۔ لہٰذا موت سے پہلے اور عملی زندگی میں روح میں ایسی قوت جو اسے عالم بالا اور عالم امر سے وابستہ کر دے یہی کمال اسلام ہے۔ آخرت کو نہ صرف سن کر مانے دیکھ بھی لے، حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیف اصبحت کس حال میں صبح کی تو انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ایمان کے ساتھ فرمایا۔ تیرے ایمان کی کیا دلیل ہے تو وہیں کھڑے کھڑے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں یہاں کھڑا ہوا برزخ گیا آخرت اور حساب کتاب کیسے ہو گا دیکھ رہا ہوں، جنتیوں اور دوزخیوں کو اپنے ٹھکانے پر جاتے دیکھ رہا ہوں بلکہ عرش رحمٰن میری نگاہ میں ہے تو فرمایا تو نے درست کہا، یعنی ان چیزوں کا مشاہدہ یا روحانی نگاہ سے ادراک ایمان کی دلیل ہے اور انہیں برکات کی تقسیم کے شعبے کو تصوف کہتے ہیں مگر کینسر زدہ لوگوں نے اس سے انکار کی راہ اپنائی بلکہ اسے ممنوع قرار دیا اور نقادوں نے اسے عملی زندگی سے فرار کا بہانہ بنایا دونوں کی رائے درست نہیں بلکہ یہ دولت پا کر انسان عملی زندگی میں بہتر مسلمان یا بہتر انسان ثابت ہوتا ہے، ایماندار تاجر بہادر سپاہی، انصاف پسند حاکم اور بہترین شہری بنتا ہے مگر افسوس کہ کینسر زدہ ارواح اس دور میں معالج سمجھی جانے لگیں اور اس تریاق کا انکار کر کے محض الفاظ کا زور دکھایا جا رہا ہے۔ نمازی بن گئے مگر خشوع نہ دارد۔ مسجد چلے گئے مگر بے سرور تسبیحات پڑھیں بے کیف تجارت میں دھوکہ اور انصاف کی جگہ ظلم نے لے لی اب اس دور کے دانشوروں کی روح کو جلا اور کمال سے انکار ہے۔ جیسے اہل مغرب لباس پہننے والے کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مگر کسی کی رائے سے حقیقت اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتی، عہد نبوی کے جو کمالات صحابہ کے مذکور ہیں جمع کئے جائیں تو بہت بڑا ذخیرہ بنتا ہے۔ حالانکہ اس دور میں ان چیزوں کو مومن کی عام صفت سمجھا گیا اور اسے خصوصیت کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا۔

اللہ کریم روحانی صحت اور روح کی آنکھ کی روشنی عطا فرمائے اور اپنے بندوں کے ساتھ رکھے یہاں بھی وہاں بھی۔ آمین

حق چار یار

رضوان اللہ علیہم اجمعین

میرے آقا کملی والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی
ایہہ وِچ حدیث دے لکھیا اے نہ جھوٹ تے نہ بہتان کوئی

جو نہیں مَندا صدیقؓ تائیں سوہنے دے ایس رفیق تائیں
لکھ لعنت اُوس زِندیق تائیں نہیں اوہدے جیہا بے ایمان کوئی
میرے آقا کملی والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی
ایہہ وِچ حدیث دے لکھیا اے نہ جھوٹ تے نہ بہتان کوئی

جو عمرؓ تے حلّے کردا اے اُوہ کافر ہو کے مَردا اے
شیطان وی جس توں ڈردا اے نہیں عمرؓ جیہا سلطان کوئی
میرے آقا کملیؐ والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی

جو نہیں مَندا عثمانؓ تائیں کیہ آکھاں اوس انسان تائیں
لکھ لعنت اوس ایمان تائیں نہیں اوہدے جیہا شیطان کوئی
میرے آقا کملیؐ والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی

کوئی ثانی نہیں جے حیدرؓ دا جس توڑیا سی دَر خیبر دا
جو منکر ولیاں دے رَہبر دا نہیں اوہدا دین ایمان کوئی
میرے آقا کملیؐ والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی
ایہہ وِچ حدیث دے لکھیا اے نہ جھوٹ تے نہ بہتان کوئی

ایہہ چارے حق دے یار سجن اِک لکھ تے چوّی ہزار سجن
سب آقا دے غمخوار سجن نہیں ایہناں جیہا اِنسان کوئی
میرے آقا کملیؐ والے دا پڑھ ویکھ لوے فرمان کوئی
ایہہ وِچ حدیث دے لکھیا اے نہ جھوٹ تے نہ بہتان کوئی

محمد مشتاق انجم

THE SPIRIT OF FASTING

By

Hadhrat Maulana Muhammad Akram

"The month of Ramadhan, in which was revealed the Quran, a guidance for mankind and clear proofs of the guidance and the Criterian (of right and wrong)"(2:185).

Ramadhan occupies a unique position of superiority and honour within the twelve months of a year. Its innumerable distinctions mentioned in the Book of Allah and the Hadith of the Holy Prophet (peace be upon him) are recounted each year. According to a Hadith, Allah's Mercy is so abounding in this month that anybody who fails to seek Allah's forgiveness is the most unfortunate person in the world. The Holy Prophet (peace be upon him) compared him with that wretched son who is unable to seek Allah's pardon by serving his old parents. But , apart from all the alluded distinctions, I wish to dilate on an entirely different aspect of this blessed month, which has been mentioned in this verse by the Gracious Lord:

The month of Ramadhan in which was revealed the Quran." Al Quran, the Personal Word of Allah, was revealed during this month. It is not a creation and is not-perishable. Like His Essence, all Attributes of Allah are non created, Primeval and Eternal and Speech is one of the most important Attributes. Revelation of the Quran was spread over a period of twenty three years. However,it is mentioned here that it was revealed within the month of Ramadhan.At yet another place,it is mentioned that it was revealed in one night (the Night of Honour). This relates to the revelation of the Quran from His Presence to that place from where the Angel could receive it because it is not possible for any angel to directly listen Allah's Speech or observe Him. No angel can withstand it. Therefore, the Gracious Lord sent it down to a station from where Jibril could access a portion of it according to Divine Will. Thereafter, Jibril communicated that revelation instantly to the Holy Prophet (peace be upon him). The Quran descended from the Divine Presence to that station in an instant in the Night of Honour and was subsequently revealed from there to the Holy Prophet (peace be upon him) in twenty three years.

The science has provided the explanations of many similar phenomenon. In our country, the TV and the VCR work on two line system, whereas in America, both function on three line systems. If

you bring a video cassette from America to watch on your system, it would not work. Your TV and VCR would be on but you would neither see any picture nor hear any sound. Similar is the case with Divine Speech. Its audition demands a correspondingly sublime level of piety. Otherwise it cannot be heard. If it is claimed that someone can hear Divine Speech, he is implicitly being recognised as a prophet because acknowledgement of his ability to receive Divine Speech is actually an admission of his prophethood and innocence. Innocence denotes that level of human piety where the ability to sin is totally absent. One person may not sin throughout his life, and may be extremely virtuous. Another person is born in a mosque, acquires religious knowledge, eats only the permitted, speaks the truth, adopts virtue, commits no sin, dies in the mosque and is buried therein. Despite their virtuous lives, none of them can be called innocent. At best, it can be said that they received Divine protection against sin. Innocence is the acme of human purification and an innocent person, despite leading a full human life, should not think of any vice. He should be so holy, so pious, so virtuous that the concept of sin should be absolutely foreign to him. Only such a person qualifies to be called innocent. This innocence bestows upon him the ability to hear Divine Speech. Some one may be very pious but unless he is innocent he will never hear Divine Speech.

Companionship is the highest rank after prophethood and Hadhrat Aisha Siddiqua (May Allah be pleased with her) occupied a unique status amongst them. She disclosed that the Holy Prophet (peace be upon him), at times, used to receive Divine Revelation while in her bed. The house of Holy Prophet (peace be upon him) did not have two beds. He shared the bed of his wife whose apartment he visited. During summers, the bed sheet was doubled and spread underneath, while in winters, half of it was spread below and the other half was used as upper cover. Some apartment had a blanket and some had a matress filled with palm leaves. Such were the beds of the Holy Prophet (peace be upon him)! When he was resting with his wives except Hazrat Aisha (May Allah be pleased with her) he did not receive Divine Revelation. This is her unique distinction. But the Divine Address was audible only to the Holy Prophet (peace be upon him) and she could not hear anything. Although she is the mother of the entire Ummah, was the beloved of Allah's beloved, Allah Himself testified about her piety and blessing in the Quran which will continue to be recited till the Dooms Day. But the level of piety and the capacity to receive the Divine Revelation is only possessed by an innocent heart which is the heart of a prophet. Some have claimed innocence for their 'Imams' (leaders) besides the prophets, which is a delusion and conspiracy against the Muslims. They knew that if they label their 'Imams' as prophets, the Muslims would be infuriated. Therefore they decided to call them 'Imams' but attributed prophetic qualities to them, thus fulfilling their insidious designs.

The Supreme Being is Incomparable and the sanctity of His Speech is also unique. Similarly, the Holy Prophet (peace be upon him) occupies a unique status in the entire creation. His speech also possesses a certain level of sanctity and also requires a definite level of piety to enable mankind to hear and understand it. Allah has created Ramadhan to bless His creation with that piety.

Mankind acquires piety through Allah's obedience which implies adopting the permitted and abandoning the prohibited. Obedience does not encompass worship alone. It does not mean prayers, fast, zakat or Hajj only. I, myself visit the holy land about four times a year. What apparent difference does that produce in me? But if Allah favours someone, he does undergo some changes which are manifest outwardly. His character and demeanour improves, he starts propagating the religion, enjoins good, forbids evil and people start benefitting from him. It shows that he has brought some beneficence and blessings which he is dispensating. Human piety means that one should abide by the Divine code of permission and prohibition. We have conveniently restricted the religion to the mosque and have separated it from the private life. We come to the mosque, wash, pray and then return to our business outside where we tell lies, deceive others and extort money from them. Then we again return to the mosque for the next prayer. Despite all this we think that we are properly fulfilling our religious obligations. That is not correct. Please do not infer that I am trying to dissuade the person who tells lies in the market from offering his prayers. At least, he is doing some good. He should not stop praying but should stop telling lies. His guilt should not preclude him from doing good. He should instead give up his vices. We devote about an hour each day for prayers and become good Muslims for this one hour. We should similarly remain good Muslims for the remaining twenty three hours of the day. The time that we spend with our parents, family, friends, business or travel should reflect and uphold our Islamic values. When all facets of our lives including ideas, beliefs, morals, social relations are completely suffused with Islam, only then we shall start discovering the sweetness in the words of the Holy Prophet (peace be upon him). Otherwise we shall neither find any attraction in Allah's Words nor in those of the Holy Prophet (peace be upon him). Of course the speech is melodious and sweet but due to our defective hearing, we would hear only unintelligible noise. Allah has given us the opportunity to improve this reception by restraining all forces which could possibly interfere with this communication. All the devils are imprisoned during the holy month of Ramadhan. But, practically we observe many devilish acts during this month. It is due to the misdeeds of those human beings who degrade themselves to the level of devils and their misconduct causes to establish a special relationship with the Satan. They neither have any respect for Ramadhan nor for Allahs' Commands. They commit sins themselves and also entice others. They actually symbolise

and represent the devils. According to His Promise, the progeny of the real Satan is imprisoned, devils in human beings remains at large and cause all mischief. The satans cannot themselves take part in this activity.

The first favour bestowed by Allah during this month is the imprisonment of the satans. The second favour is the increase in reward of all good deeds by seventy times and the upgradation of the reward of all supererogatory worship equal to that of mandatory worship. The third favour is the degree of nearness which His slaves can attain through His obedience. While fasting a Muslim feels Divine Presence throughout the day and requests his Lord's permission for everything. Some years ago, I was travelling during Ramadhan. It was an extremely hot day. A shepherd was brining his sheep to a pond near the road. The thirsty animals leaped into the pond and started drinking. But the shepherd only washed himself and stood to pray before his Lord. What stopped him from slaking his thirst? It was the strength of his relationship with his Lord and the realization of His Omnipresence. During Ramadhan, even a common Muslim is granted Divine Nearness and that level of holiness where he can easily follow the Holy Prophet (peace be upon him). Let's not talk of salvation or reward; they come later. But if we fail to acquire that piety in Ramdhan, we shall not be able to understand the Holy Prophet (peace be upon him). Once we discern the good in his words, only then we would be able to follow him with devotion.

Man is gregarious by nature and prefers to live in groups. He is dependent upon others in many aspects of his life and therefore he cannot live alone. He needs many things from others. We have named these needs as love. Wordily excellence draws many quasi lovers but they all desert quickly and quietly when that excellence is lost. We portray our dependence upon others as our love for them. This definition is incorrect. Love is that relationship which is beyond reason and greed. The lover does not care whether the fulfillment of his beloved's desire is easy or difficult. He only hears and obeys. Love also requires a certain level of harmony and the lover is attracted only by his beloved. According to a famous proverb 'lover is the one who submits completely to the beloved.' Allah is Most worthy of love because He is Absolute. He has no needs and does not expect anything from anyone. His love is above any such motives because He is the Giver of everything to everyone. The the Holy Prophet (peace be upon him) deserves to be loved because he is subservient to none except Allah. He too has no expectations from any human being. Whether he shows kindness to someone or advises him, both aspects of his relationship contain countless blessings.

Majnoon (title of a famous Arab of old time, lit: mad person, real name Umra-ul-Qais) belonged to a rich family and was deeply in love

with Laila. He was the class-fellow of Hazrat Hassan, who abdicated in favour of Ameer Muawiyah (May Allah be pleased with them) to save the Muslim Ummah from a great tragedy. As a token of Allah's gratitude, he set out to perform Hajj and took his friend Qais with him. They were riding their camels when Hazrat Hassan (May Allah be pleased with him) said: "Allah has indeed blessed me that I have handed over the govt to my uncle. He has great potential to manage its affairs. He will serve the religions, look after peoples' welfare and extend the frontiers of the Islamic state. God willing, you shall see that my decision wasn't wrong." His friend listended quietly and retorted: if you ask the truth, none of you really deserves this honour." Hazrat Hassan (May Allah be pleased with him) was amazed. "Then who deserves it?" he inquired in surprise. "Laila alone!" replied Qais. "Are you 'majnoon'?" exclaimed Hazrat Hassan (May Allah be pleased with him). From then onwards Qais was popularly known as 'Majnoon'. That is love! He was not bothered about the welfare of the Ummah. He was neither concerned with the personality of Hazrat Hassan nor with the chivalry of Hazrat Ameer Mauwiyah (May Allah be pleased with him). He did not care about anybody's defeat or victory. His only concern was Laila! Once his father took him to the Holy Kaaba. He grabbed the covering of Allah's house and prayed for the recovery of his son from all ailments. Qais said'" O Allah! heal all my maladies but please do not take Laila's love away." Laila may not be beautiful or melodious but for Qais she was the most beautiful woman with the sweetest voice because she was his beloved. It requires a definite level of piety to comprehend Allah"s Commands and the sayings of the Holy Prophet (peace be upon him). We must make some effort to align our hearts, with that of the Holy Prophet (peace be upon him). To facilitate this achievement, Allah has imprisoned the devils, increased the reward of all worships and declared," I, Myself, am the Rewarder of fasting". With so many favours from Allah, we must purify our inner self to that extent where it starts appreciating the sweetness of prophetic discourse and is led to his unquestioned, voluntary obedience.If we attain to this level during Ramadhan,then we have achieved its purpose otherwise we have lost our golden chance of salvation. As for His forgiveness, it is His good pleasure to forgive even the worst sinner. No one can question Him.Hadhrat Ibrahim (peace be upon him) had made a similar prayer entreating," if you chastise them, they are you bondmen but if you forgive them, you indeed are the Forgiving, the Merciful." His Mercy is fathomless; no one knows on what account He may forgive someone. The Holy Prophet (peace be upon him) narrated the incident of a bad woman of Bani Israil. During a journey, she observed a dog dying of thirst beside a small well. She shredded her head cover, made it into a rope, tied her shoe with it and drew water from the well. She kept pouring that small quantity of water in the dog's mouth till it completely recovered. Allah forgave all her sins for saving the dog's life and sent her to paradise. His Mercy is indeed Infinite, He may remit all sins for saving a dog. But His forgiveness

should not be our only aim. We should try to partake from His Blessings, should appreciate the grandeur and beauty of the universe around us and should absorb the Divine Lights and Refulgence. That is the real achievement. We should aim at saturating our hearts with His Effulgence and the blessings of the Holy Prophet (peace be upon him). With reference to this Quranic Verse, I want to draw your attention to this aspect of Ramadhan. Do not view it from the angle of forgiveness alone. The real and greater aspect is the development of angelic attributes in the human beings and the realization of constant Divine Presence. Aim at attaining that level of soul purification where the Commands of Allah, conveyed by His Holy Prophet (peace be upon him) get deeply and firmly embedded in our hearts and we acquire the strength to follow them. Otherwise, despite all efforts, every rising sun will find us even worse than yesterday.

For Allah's sake worry about yourselves. Remember those who were here with us during the last Ramadhan but are now gone. No one knows whether he will be alive till the next opportunity. So fully avail this chance and time. It is not possible to achieve that degree of purification during the entire year which one attains during this blessed month. Remember Allah much and entreat Him to endow the ability to understand His Command and the teachings of His Holy Prophet (peace be upon him).

حدیث سہل بن سعد رضی اللہ عنہ: حضرت سہلؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کسی نے دودھ کا پیالہ بھیجا تو آپؐ نے اس میں سے کسی قدر خود پیا۔ اس وقت آپؐ کے داہنی جانب ایک لڑکا بیٹھا تھا جو حاضرین میں سب سے چھوٹا تھا اور بڑی عمر کے لوگ آپؐ کے بائیں جانب بیٹھے تھے۔ لہٰذا آپؐ نے اس لڑکے سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے لڑکے کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں یہ (دودھ) بزرگوں کو دے دوں؟ وہ لڑکا کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں آپؐ کے بچے ہوئے تبرک کے سلسلے میں کسی دوسرے کے لیے ایثار نہیں کر سکتا (کسی دوسرے کو خود پر ترجیح نہیں دے سکتا) چنانچہ آپؐ نے وہ دودھ اسے دے دیا۔

اخرجه البخاری فی: کتاب ۷۲ الشرب والمساقات: باب ۱ فی الشرب

حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ: حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مشک کو الٹا کر کے اس کے منہ سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

اخرجه البخاری فی: کتاب ۷۴ الاشربة: باب ۲۳ اختناث الاسقية